شمارہ ۱۱، ۲۰۲۲ء

نمود

طلبہ کا سالانہ ادبی رسالہ

مدیر: زاہد حسن

نائب مدیران: مریم عامر، نتالیہ حیات

گرمانی مرکزِ زبان و ادب

LUMS | Gurmani Centre for Languages and Literature

فہرست

اداریہ

اردو

مضامین

انتظار حسین کے افسانے ''شہر افسوس'' کا فکری و فنی تجزیہ	لائبہ طارق	(طالبہ لمز)	۱۱
نیّر مسعود کے افسانے ''طاؤس چمن کی مینا'' کا فکری و فنی تجزیہ	محمد علی کمیل	(طالب علم لمز)	۱۹
انتظار حسین کے افسانے ''زرد کُتا'' کا فنی و فکری جائزہ	احمد ابو بکر	(طالب علم لمز)	۲۶
دو چشمی ''ھ'' اور ''ہ'' کا استعمال	فرحان سلیم	(ریسرچ اسسٹنٹ)	۳۴

''آگ کا دریا'' کے بعد کی کہانیاں

جنگ کی حمایت میں لکھے گئے حروف	عبد الحلیم عالم	(طالب علم لمز)	۳۶
گنگا کے کنارے، غازی کا عَلَم ہوتا	دعا زہرا	(طالبہ لمز)	۴۵

افسانے / کہانیاں

بریٹینیا	معروف تاج	(طالب علم لمز)	۵۸
دائی انجن	سید ارتضیٰ حیدر زیدی	(طالب علم لمز)	۷۳
پگ والی مائی ''گلّاں''	مریم عامر	(طالبہ لمز)	۷۸
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ	صدف یاسمین	(طالبہ لمز)	۸۰
قصور	عبد اللہ محمود	(طالب علم لمز)	۸۳
میرے بچپن کے دن	صدف یاسمین	(طالبہ لمز)	۸۸
کس نے کہا تھا	ضیغم علی	(طالب علم لمز)	۹۰

ڈائری نویسی

میری ڈائری کے اوراق	ایمن فاطمہ	(طالبہ لمز)	۹۳

غزلیں

مجھ سے نفرت کرتے کرتے تو بھی مجھ سا ہو گیا	راز احتشام	(طالب علم لمز)	۹۸
ہم اندھے لوگوں کو آئینہ خانہ لے آئے	راز احتشام	(طالب علم لمز)	۹۹
مفلسی کا دور ہے، فاقہ کشی کا زور ہے اب	نائلہ عابد	(طالبہ لمز)	۱۰۰
جب دوسروں کو ہنستے دیکھتا ہوں	محمد فہد اشفاق	(طالب علم لمز)	۱۰۲
حیوانوں سے نہیں اب انسانوں سے ڈر لگتا ہے	محمد فہد اشفاق	(طالب علم لمز)	۱۰۳
وہ کہہ رہا تھا ہمارے آنگن میں تم جو آتے تو عید ہوتی	سیّد علی مدثر	(طالب علم لمز)	۱۰۴

پنجابی

مضامین

آ بھین فاطمہ!	زاہد حسن	(استاد لمز)	۱۰۷

افسانے / کہانیاں

حق شکور سرکار	سید محمد عبد اللہ	(طالب علم لمز)	۱۱۰
اشرافیا	علی رضا	(طالب علم لمز)	۱۱۵

ڈائری نویسی

میری ڈائری	عبد المعید	(طالب علم لمز)	۱۲۰

رپورتاژ

ماں بولی "پنجابی زبان" دی اہمیت	عبد المعید	(طالب علم لمز)	۱۲۵

پشتو

تعارف

د طارق محمود صېب سر سري پېژندګلو	شاہ محمود خان	(طالب علم لمز)	۱۲۹

نظم

ځامنګي ته	شاہ محمود خان	(طالب علم لمز)	۱۳۱

غزلیں

لر يم او كه بريم خلۀ مې وچه ده	شاہ محمود خان	(طالب علم لمز)	۱۳۷
په كار مې نۀ دي سپرلي هم چې فاصلې راولي	شاہ محمود خان	(طالب علم لمز)	۱۳۹

بلوچی

ترجمہ

ڈراجیں کِسہ (انتظار حسین کے افسانے "لباقصہ" کا ترجمہ)	عبدالحلیم	(طالب علم لمز)	۱۴۳

غزل

دستونک	عبدالحلیم	(طالب علم لمز)	۱۴۶

سندھی

مضمون

شاھ عبداللطيف ڀٽائي جي باري ۾ بنيادي معلومات	محمد علی	(طالب علم لمز)	۱۴۹

غزل

بیت	اشوک کمار	(استاد لمز)	۱۶۶
وائی	اشوک کمار	(استاد لمز)	۱۶۷
گیت	اشوک کمار	(استاد لمز)	۱۶۸
نیٹن	رباب میمن	(طالب علم لمز)	۱۶۹
آزاد نظم	محمد صدیق	(طالب علم لمز)	۱۷۰

عربی

کہانی

اَضْرَارُ الخَوْف (خوف کے نقصانات)	محمد عمیر سلہری	(طالب علم لمز)	۱۷۳

اداریہ

نمود کا تازہ شمارہ آپ کے مطالعہ کے لیے پیشِ خدمت ہے۔ نمود، لمز کے طلبا و طالبات کی شعری، نثری، تحقیقی اور تنقیدی نگارشات پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ مسلسل گیارہواں شمارہ ہے یعنی اسے شایع ہوتے اور ہمیں طلبا کی تحریروں سے مستفید ہوتے گیارہ برس ہوگئے۔ ان گیارہ برسوں کے دوران دنیا بھر میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں، ان تبدیلیوں کے اثرات پاکستان میں ہر شعبۂ زندگی پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ یہ اثرات ہمیں نمود میں شایع ہونے والی طلبا کی تحریروں میں بھی نظر آتے ہیں۔ یہ نہایت مثبت عمل ہے کہ انسانی زندگی پر پڑنے والے اثرات کا بیان اس عہد کے لکھنے والے کے یہاں ہوتا ہے۔ نوجوان نسل کے یہاں اس کا اظہار اس سے بھی خوش کُن عمل ہے۔

کووڈ-۱۹ نے انسانی زندگی کو جس بُری طرح متاثر کیا، اس کے جسمانی اور نفسیاتی اثرات کا بیانیہ بھی اس دوران لکھے جانے والے ادب میں ہوا۔ خاص طور پر قریبی عزیزوں اور رشتہ داروں کو اس کا شکار ہوتے دیکھ کر اور اس سے بھی بڑھ کر اس کے نتیجے میں نسلِ آدم کے حصّے میں جس طرح کی تنہائی آئی، اس کی نظیر بھی تاریخِ انسانی میں کم کم ہی ملتی ہے۔ نوجوانوں کے یہاں تخلیق ہونے والے ادب پر اس کے اثرات بھی گہرے طور پر مرتب ہوئے جس کی کئی ایک مثالیں اس عہد میں تخلیق ہونے والے ادب میں ملتی ہیں۔ طلبا نے اپنی ذاتی تحریروں کے علاوہ ادب کے بڑے ناموں کے شاہ کار افسانوں، ناولوں پر اپنی تنقیدی رائے کا اظہار بھی نہایت معتدل اور دانش مندانہ سلیقے سے کیا ہے۔ اس اظہار کی حامل کچھ تحریریں زیرِ مطالعہ نمود میں شامل ہیں۔

نمود کے حوالے سے ایک اور مثبت پیش رفت جو گزشتہ برس سے عمل میں آئی، پاکستان کی قومی

زبانوں کے ادب کو اس میں پیش کرنا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر نئی نسل کی اپنی مادری زبانوں کے ساتھ وابستگی اور اسے اپنے تخلیقی عمل کا حصہ بنانا ہے۔ نمود کے گزشتہ شمارے میں بھی پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، عربی اور فارسی زبانوں کی تخلیقات شامل کی گئی تھیں، اس بار بھی ان زبانوں میں تخلیق ہونے والے ادب کا نمایاں حصہ اس میں موجود ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ ان کا معیار دیگر زبانوں میں لکھے جانے والے ادب سے کسی بھی طور کم نہیں۔ یہ امر اس لیے بھی خوش آئند ہے کہ لمز جیسے علمی ادارے میں شعر و ادب کی روایت نہ صرف برقرار ہے بلکہ ہر آئے روز اس میں بہتری پیدا ہو رہی ہے، اس کا سہرا گرمانی مرکزِ زبان و ادب کو جاتا ہے۔ جہاں پاکستان کی قومی زبانوں کو نہ صرف تعلیم کا حصّہ بنایا گیا ہے بلکہ ان زبانوں کی تواریخ، تہذیب، لوک ادب اور علمی و ادبی رجحانات کو تحقیق کا موضوع بھی بنایا جاتا ہے۔

وہ تمام تر طلبا و طالبات خصوصی شکریے کے مستحق ہیں جن کی شعری و نثری نگارشات نمود کا حصّہ ہیں۔

زاہد حسن

اردو

- مضامین ۱۱
- ”آگ کا دریا“ کے بعد کی کہانیاں ۳۶
- افسانے / کہانیاں ۵۸
- ڈائری نویسی ۹۳
- غزلیں ۹۸

لائبہ طارق

انتظار حسین کے افسانے ''شہر افسوس'' کا فکری و فنی تجزیہ

قیامِ پاکستان کے بعد کے اہم افسانہ نگاروں میں ایک بڑا نام انتظار حسین کا بھی ہے۔ ان کا ذکر آتے ہی انسانی ذہن ماضی کی یادوں کے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔ داستاں، عہد نامے اور دیومالائی قصے کی ایک نئی دنیا آباد ہو جاتی ہے۔ انتظار حسین کے بیشتر افسانوں میں تقسیمِ ہند اور اس کے بعد ہجرت کی تکالیف، مصائب، ماضی کے دُکھ درد، صدمے اور جدید دور کے مسائل جیسے موضوعات بیان کیے گئے ہیں۔ تقسیم ہند کے ساتھ ساتھ اسلامی کلچر، تاریخ، سقوطِ ڈھاکہ اور ہندو پاک جنگ بھی ان کے افسانوں کے موضوعات کی فہرست میں نمایاں ہیں۔

''شہر افسوس'' بھی کم و بیش درجہ بالا تمام موضوعات کی عکاسی کرتا ہوا ایک افسانہ ہے۔ سلیم الرحمٰن شہر افسوس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> شہر افسوس میں اول تا آخر ایک ہیجانی کیفیت ہے، ان افسانوں کے کردار اور تو خیر کیا، اپنے نام تک بھول چکے ہیں۔

اور وہ بالکل بجا فرماتے ہیں کیوں کہ اس افسانے میں ایسے کئی مناظر پیش کیے گئے ہیں جہاں ہر شخص جان بچانے کے لیے دوڑا پھر رہا ہے جیسے کسی جائے پناہ کی تلاش میں ہو مگر ایک خوف کی فضا اس وقت قائم ہوتی ہے کہ بھاگ دوڑ کے باوجود کسی کو جائے فرار یا نجات کا کوئی رستہ کھُلا ہوا دکھائی نہیں دے رہا۔ پورے افسانے کی فضا میں بے یقینی، بے مقصدیت، خوف اور بد گمانی کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ زمان و مکاں (Time and Space) کا احساس تک کرچی کرچی ہو چکا ہے اور یہ جو خود کو پہچان لینے اور کسی جگہ پر مقیم ہونے کی خواہش ہے انسان کی نیّت اور اس کی فطرت سے جُدا اور اُکھڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس افسانے میں انتظار حسین نے بڑی مہارت کے ساتھ علامتی اور استعاراتی عناصر کا بھرپور استعمال کیا ہے اور ان کی یہ مہارت ان کا

ذاتی اسلوب ہے۔ وہ اس خوب صورتی سے علامتوں اور استعاروں کا استعمال کرتے ہیں کہ پڑھنے والا کہانی کو زمان و مکاں سے بالاتر محسوس کرتا ہے کیوں کہ یہ کہانیاں ماضی کی تاریکیوں کو اس انداز میں بیان کرتی ہیں کہ حال کے مسائل اور تکالیف اُمڈ کر سطح پر آجاتے ہیں۔

محمد عمر میمن، ڈان اخبار کے مضمون میں انتظار حسین کے افسانوں کا فنی و فکری تجزیہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہجرت کا واقعہ انتظار حسین کے لیے بنیادی واقعہ ہے جس نے اس خطے میں مستقبل میں ہونے والے واقعات پر براہِ راست اثر کیا ہے اور انتظار حسین نے ہجرت کے اسی واقعے کو تخلیقی عمل کے طور پر استعمال کیا ہے۔

محمد عمر میمن انتظار حسین کے افسانوں کے موضوعات کی درجہ بندی تین سطحوں پر انجام دیتے ہیں۔ سب سے پہلی سطح ماضی کے واقعات کی بازیافت میں کسی درجہ کامیابی ہے مگر اس میں ناکامی انسان کی اخلاقی قدروں میں بگاڑ اور گراوٹ کا باعث بنتی ہے جو نتیجتاً انسان کی زندگی سے تخلیقی عمل کے معدوم ہو جانے کی وجہ بنتا ہے۔

''شہرِ افسوس'' میں بھی اخلاقی زوال اور نتیجتاً ہونے والی انسانی ذات کی موت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ افسانہ ۱۹۷۱ء میں بنگلا دیش کی علیحدگی کے کچھ عرصہ بعد ہی لکھا گیا لہٰذا کہیں نہ کہیں اس افسانے میں اس سانحے کا اثر موجود ہے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ہند کی بنیاد مذہبی تفرقات بنے تھے لیکن مذہب مشرقی و مغربی پاکستان کے لوگوں کو متحد کرنے میں ایک طاقت ور قوت کے طور پر عمل نہ کر پایا اور حالات اس قدر بگڑے کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ ۱۹۷۱ء میں ہونے والے ظلم و جبر اور غیر انسانی واقعات کو انفرادی اخلاقی شعور کی کمی اور تباہ کاری کی مدد سے ہی بیان کیا جا سکتا ہے۔

اس افسانے کے پسِ پردہ جو فکر اور سوچ کار فرما تھی، اگر اس کا ذکر کیا جائے تو ایک بنیادی موضوع ''اخلاقی موت'' کا ہمارے سامنے اجاگر ہوتا ہے۔ افسانے کے آغاز میں ہی یہ موضوع واضح ہو جاتا ہے جب پہلا آدمی کہتا ہے:

میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں کہ میں تو مر گیا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ وہ مرا کیسے۔ ۱۹۷۱ء کے فسادات میں یہ پہلا آدمی خود بھی حصہ دار تھا۔ اس نے ایک بھائی سے اس کی بہن کو جبراً برہنہ کروایا تھا۔ لڑکی کے حلیے سے وہ بنگالی ہی لگتی تھی جس کے ماتھے پر بندیا اور بدن پر ساڑھی تھی۔ افراتفری اور فسادات کے اس دور میں وہی لڑکا جب پہلے آدمی کے روبرو ہوا تو حالات بالکل پلٹ چکے تھے اور اب اس لڑکے نے پہلے آدمی کو مجبور کر دیا کہ اسے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی بیٹی کی عصمت دری کرنا پڑی۔ اس سانحے کے بعد پہلے آدمی کو مر جانا چاہیے تھے، مگر وہ زندہ رہا۔ وہ اس جیسی ان گنت تباہ کاریوں، اخلاقی جرائم اور انسانیت کی تذلیل کو دیکھنے کے لیے زندہ رہا۔ تیسرے آدمی کی حالت پہلے اور دوسرے آدمی سے بھی بدتر ہے کیوں کہ وہ نہ زندوں میں ہے نہ مُردوں میں، وہ تو کھو چکا ہے۔ خود کو تلاش کرنے کا یہ عمل موت سے بدتر اور اذیّت ناک ہے۔

یہ بات واضح کرنا لازم ہے کہ اس افسانے میں ۱۹۷۱ء کے واقعات کا اثر معلوم ہوتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ یہ افسانہ ان واقعات پر ہی مبنی ہو، یہاں انتظار حسین کا مقصد تاریخ کے واقعات بیان کرنے سے کہیں زیادہ تاریخ میں انسانی حقیقت، اس کی فطرت اور اخلاقیات کا اصل چہرہ نمایاں کرنا ہے۔

انتظار حسین کے تمام افسانوں میں تقریباً بنیادی تصوّر اور فکر یکساں ہے اور وہ یہ ہے کہ انھیں اپنی مٹی سے بہت لگاؤ ہے اور وہ اس مٹی سے بچھڑ چکے ہیں۔ انھیں اپنی مٹی سے بچھڑ جانے کا غم دنیا کے ہر غم سے بڑا اور کرب ناک محسوس ہوتا ہے اور یہی کرب ان کے تخلیقی تجربے کو بنیاد فراہم کرتا ہے۔ افسانہ ''شہر افسوس'' میں جب دوسرا آدمی بوڑھے آدمی سے مخاطب ہوتا ہے تو کہتا ہے:

> اے بزرگ کیا تُو نے دیکھا نہیں کہ جو لوگ اپنی زمین سے بچھڑ جاتے ہیں پھر کوئی زمین انھیں قبول نہیں کرتی۔

فکری اعتبار سے انتظار حسین نے اپنے افسانوں میں تہذیب اور کلچر کے پسِ منظر میں انسان کے روحانی، ذہنی اور اخلاقی زوال کو موضوع بنایا ہے۔ اس کے نزدیک انسانی ذات کی شناخت بنیادی اہمیت کی حامل

ہے اور ایک انسان کی شخصیت کسی تہذیب اور ثقافت کے بغیر نامکمل ہے۔ تہذیب سے رابطہ منقطع ہو جانے پر انسان خلا میں تیرتے بے سہارا ذروں کی مانند ہو جاتا ہے جن کی بظاہر کوئی منزل نہیں ہوتی۔

ایک بار تہذیب سے انسان الگ ہو جائے اور اس کا ربط اپنی جڑوں سے ٹوٹ جائے تو پھر کائنات کے کسی مقام، کسی تہذیب اور کسی ثقافت میں بھی وہ اپنی شناخت نہ تو قائم کر سکتا ہے اور نہ ہی اپنی گزشتہ شناخت کو بحال کر سکتا ہے۔ ''شہر افسوس'' کے تمام کردار بھی اس معمہ میں مبتلا ہیں۔ وہ اسی تکلیف سے گزر رہے ہیں جو انسان اپنی تہذیب سے جدا ہو جانے پر محسوس کرتا ہے۔ اپنی بنیاد ہِل جانے پر ان کرداروں کے اندر ذہنی، اخلاقی اور روحانی زوال نمودار ہوتا ہے جو ان کے لیے جینے اور مرنے کے درمیان فرق کو مٹا دیتا ہے۔ افسانے میں ایک جگہ تیسرا آدمی کہتا ہے:

> اپنے آپ کو پہچاننے کے بعد زندہ رہنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔

یہ تمام کردار جس شدید روحانی اور اخلاقی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکے ہیں، ان کے لیے اس سانحے کو قبول کرنے کے بعد زندگی اور موت برابر ہی ہیں۔ ''شہر افسوس'' کے کرداروں کی کیفیت کی بات جاری رکھتے ہوئے اگر دیکھا جائے تو وہ تمام کردار Exodus یعنی ''خروج'' کا شکار ہیں۔ نہ صرف ایک بار بلکہ انھوں نے ماضی کے المیے کو دوبارہ جیا ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد ان کرداروں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> اُن افسانوں کے سارے کردار حزن و ملال یا سوگ کی حالت میں ہیں۔ وہ اُکھڑے ہوئے، جڑوں سے محروم، معاشرت کے نظامِ نسبتی کی کشش سے آزاد، آنکھوں میں تعبیر کی کرچیاں لیے مانوس سے نامانوس اور معلوم سے نامعلوم کی طرف ہیں۔

انتظار حسین نے کافی حد تک مذہب، ذات پات اور تمام سماجی تفریقات سے بالاتر ہو کر تقسیم اور ہجرت کے سانحے کا ایک انسان پر اثر بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان حالات میں ایک انسان کا ردِّ عمل کیا ہو سکتا تھا، اس کو رُونما کرنے کی کاوش کی ہے۔ ان کے ہاں تَرکِ وطن زمین سے الگ ہونا نہیں ہے بلکہ تہذیب اور ماضی سے کَٹ جانا ہے جو ایک انسان کے لیے ناسٹیلجیا (Nostalgia) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ شہر افسوس میں

بھی انسان کی کیفیت بیان کی گئی ہے نہ کہ ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی کی۔ کرب اور تکلیف سب انسانوں میں برابری کی سطح پر تقسیم ہوئی۔ اس افسانے کے کرداروں کو انتظار حسین نے اس طرح سے پیش کیا ہے کہ وہ اپنی ذاتی محرومی کا اظہار ان کے توسط سے کرتے ہیں اور ان تمام لوگوں کی کیفیت بھی بیان کی ہے جو ان مسائل کے رُوبرُو تھے۔ پہلا آدمی ایک جگہ کہتا ہے:

> خراب رفتہ ہو کر آخر اس کوچے میں پہنچا جہاں میرا گھر تھا۔ اس کوچے میں خوف کا ڈیرہ تھا۔ میری گلی کا کُتا بیچ گلی میں منھ اُٹھائے اور سامنے نظریں گاڑھے بیٹھا تھا۔۔۔۔ وہ ایک مانوس ادا سے دم ہلاتا تھا۔ آج۔۔۔۔ عناد بھری نظروں سے مجھے گھُور رہا تھا۔

ان جملوں میں علامتی طور پر ان حالات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ لوگ جو ایک جگہ کے باسی تھے اور ایک دوسرے سے مانوس تھے، وہ ہی اب ایک دوسرے کے خلاف عناد اور نفرت سے بھرے ہوئے ہیں۔ وہ تمام لوگ جو مشرقی پاکستان میں آئے انھیں یہیں کے لوگوں اور اپنی ہی مٹی نے دھتکار دیا۔ اب وہ ہوا میں ریت کے ذرّوں کی طرح بے مقصد لہرا رہے ہیں، نہ وہ کوئی شناخت رکھتے ہیں نہ کوئی پہچان۔

زمین سے بے دخلی اور اپنی جڑوں سے کَٹ جانے کی اسی اذیّت کے بارے میں انتظار حسین خود لکھتے ہیں:

> میں اپنی مصیبت میں زمینوں اور زمانوں میں آوارہ پھرتا ہوں۔ کتنے دنوں اجودھیا اور کربلا کے بیچ مارا مارا پھرتا رہا۔ یہ جاننے کے لیے کہ جب بھلے آدمی اپنی بستی چھوڑتے ہیں تو ان پر کیا بیتی ہے اور خود بستی پر کیا بیتی ہے۔

اسی احساس کو انھوں نے ''شہر افسوس'' کے کرداروں کی کیفیت میں دکھایا ہے اور برباد ہو جانے والی بستیوں کی منظر کشی بھی کی ہے کہ کیسے وہاں مُردہ جسم بکھرے پڑے ہیں۔ بھوک، افلاس، غربت، بے گھر افراد، گلی کوچوں میں مکمل بربادی کے حالات میں بھی زندہ رہنے کی اذیّت سے گزر رہے ہیں کیوں کہ جس بستی پر انھیں مان تھا، اسی بستی نے انھیں اپنے اندر سمونے سے انکار کر دیا۔

''شہرِ افسوس'' کا مطالعہ کرتے ہوئے انتظار حسین کے ہاں عورت اور اس کی موجودگی بہت مبہم معلوم ہوتی ہے۔ اس افسانے میں تین عورتوں کا ذکر آیا ہے۔ پہلے آدمی نے جس لڑکی کو اس کے بھائی سے برہنہ کروایا، دوسری عورت اُس کی اپنی بیٹی ہے جو اس کے اپنے ہاتھوں برہنہ ہوئی اور تیسری عورت اُس آدمی کی بیوی ہے۔ غیر معمولی طور پر ان تمام عورتوں کا کوئی نام نہیں لیا گیا۔ اُن کی شناخت بھی پہلے آدمی سے ان کے تعلق کی بنا پر بیان کی گئی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس جلاوطنی، لاوطنیت، اجنبیت اور انسانیت کی تذلیل کے دور میں عورت پر گزرنے والی کہانی جیسے اَن کہی معلوم ہوتی ہے۔ وزیر آغا لکھتے ہیں:

> جنس جتنی پُرکشش ہے اتنی ہی خوف ناک بھی ہے۔ چناں چہ بعض طبیعتیں جنس سے خوف زدہ ہوتی ہیں اور بعض اس کے کالی کے روپ میں بھی بے پناہ کشش محسوس کرتی ہیں۔

اور غالباً انتظار حسین اس سے خوف زدہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس افسانے میں بھی وہ عورت کے اندر کی واردات کو چھُونے سے گریز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر ایسا کرنے میں بھی وہ مرد و عورت کے درمیان جنسی تعلق کی نوعیت کو عیاں کرنے میں ہر درجہ کامیاب ہیں، مگر شاید وہ اس تعلق کی ہوس بھری گھناؤنی شکل کو برملا پیش کرنے سے کتراتے ہیں۔ ایسا کرنے میں کہیں نہ کہیں عورت کے وجود پر صدیوں سے جو ظلم ہوتے آرہے ہیں اور ان کے ساتھ تقسیمِ ہند اور سقوطِ ڈھاکہ، ہجرت کے دوران پیش آنے والے جبر و زیادتی کا منصفانہ اظہار کسی حد تک ان کے ہاں غیر موجود ہے مگر موجود بھی ہے اور ایک مختلف اور اپنے سے انداز میں موجود ہے۔

''شہرِ افسوس'' میں عورت کے وجود کے ساتھ اس سے وابستہ مردوں کی عزت، شرم و حیا جڑی ہوئی ہے۔ اگر کسی مرد کی بہن، بیٹی، بہو یا بیوی کی عزت لُٹ جائے تو اس مرد کی عزت لُٹ جاتی ہے، چناں چہ مرد عورت کی عزت کا محافظ بھی ہے اور اس کو لوٹنے والا بھی وہی ہے، جب کہ عورت کی اپنی عزت کا اس کی ذات سے کیا تعلق ہے، وہ ایک سوالیہ نشان کھڑا کر دیتا ہے۔ انتظار حسین کے ہاں عورت رشتوں اور تعلّقات کا لحاظ رکھنے والی ہے جو کہ ''شہرِ افسوس'' میں بھی نظر آتا ہے جب ایک عورت اپنے بھائی کے ہاتھوں اور ایک بیٹی اپنے

باپ کے ہاتھوں برہنہ کی جاتی ہے۔

ارتضیٰ کریم کے مطابق انتظار حسین دیگر ادیبوں کے برعکس سوچتے ہیں۔ زیادہ تر ادیب مرد اور عورت کے تعلق کو جنسی ملاپ اور اختلاط کے ترازو میں تولتے ہیں اور ایسے انداز میں اس رشتے کو دیکھنے کے نتیجے میں یہ تعلق تعمیری کم اور تخریبی زیادہ نظر آتا ہے۔ بہت سارے ادیبوں کے ہاں یہ سوچ کارفرما ہوتی ہے کہ وہ عورت کو مظلوم اور کمزور جب کہ مرد کو ظالم اور طاقت ور دکھائیں، لیکن انتظار حسین کے ہاں ذرا اس معاملے کو مختلف انداز میں پرکھا گیا ہے۔ وہ ظلم و جبر کو جنس یعنی مرد و عورت ہونے سے وابستہ نہیں کرتے بلکہ اس کو انسانی فطرت کا حصّہ گردانتے ہیں اس لیے ''شہر افسوس'' میں بھی انھوں نے ایسا بیانیہ اختیار کیا ہے کہ مرد اور عورت کے جنسی رشتے کو گندگی اور غلاظت میں لپیٹ کر دکھانے کے بجائے اس کی خوب صورتی بھی برقرار رکھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ عورت پر ہونے والے جبر کی عکاسی بھی کی ہے۔

انتظار حسین کے افسانوں کا فنی جائزہ لینے پر ان کے فن کے کچھ اور پہلو بھی نمایاں ہوئے ہیں۔ انھوں نے اس انداز میں علامتی زبان کا استعمال کیا ہے کہ جزو کہہ کر کُل مُراد لی ہے، یعنی اپنے کرداروں کی مدد سے جو ''شہر افسوس'' میں شامل کیے گئے ہیں، انھوں نے اُس وقت کے معاشرے اور اس معاشرے کے تمام افراد جو مختلف مذاہب اور طبقات سے تعلق رکھتے ہیں، کے حالات کو بیان کیا ہے۔ ان کے بیانیہ انداز پر یقیناً داستانوں اور دیومالا (Mythology) کا اثر نمایاں طور پر اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ جس انداز میں انھوں نے ''شہر افسوس'' کے اندر ایسی فضا قائم کی ہے کہ پڑھنے والا ماضی کے آئنے میں بھی جھانک کر دیکھ سکتا ہے اور موجودہ دور میں رونما ہونے والے سیاسی، معاشرتی و معاشی مسائل کے پسِ منظر میں بھی ان کہانیوں کو پرکھ سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ موجودہ حالات اور واقعات کی، ان کہانیوں کے ذریعے ماضی سے مطابقت بھی قائم کر سکتا ہے، لہٰذا مطالعہ کرتے ہوئے بہ یک وقت کئی ادوار اور کئی جگہوں کا تصوّر قاری کے لیے ممکن ہے جو کہ حقیقی ہونے سے کہیں زیادہ دیومالائی (Mythological) معلوم ہوتا ہے۔ انتظار حسین کے اسی فن پر تبصرہ کرتے ہوئے گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> انتظار حسین کا فن آج کے کھوئے ہوئے یقین کی تلاش کا فن اس لیے ہے کہ مستقبل کا انسان اپنی آگہی حاصل کر سکے اور اپنی ذات کو برقرار رکھ سکے۔ اس کے لیے انھیں پرانے عہدنامے، انجیل، قصص الانبیاء، دیومالا، بودھ جاتکا، پرانوں، داستانوں اور صوفیا کے ملفوظات سب سے استفادہ کرنا پڑا ہے اور نتیجتاً ایسا انداز اظہارِ وجود میں آیا ہے جو خاص اُن کا اپنا ہے۔ انتظار حسین کا فن خاصہ تہہ دار اور پُر پیچ ہے جہاں ایک طرف اس کی سادگی فریبِ نظر فراہم کرتی ہے، وہیں دوسری طرف اس کی پُرکاری سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ان الفاظ کو اگر ''شہر افسوس'' کی روشنی میں دیکھا جائے تو حرف بہ حرف یہ افسانہ اوپر بیان کیے گئے ان تمام فنی پہلوؤں کی تجسیم ہے۔ اس افسانے کا پیغام اور عنوان ایک حد تک واضح ہے۔ اخلاقی قدروں کی پامالی اور انسانیت کی تحقیر کی وجہ انسان کا اپنی جڑوں سے رابطہ کٹ جانا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اس میں پیچیدگی اس وقت داخل ہوتی ہے جب انسان کی فطرت اور ذات کا تصوّر اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا صرف ایک پہلو کو ان تہوں سے جدا کر کے دیکھنے سے افسانے کے مکمل معانی کا شعوری طور پر پوری طرح ادراک نہیں ہو پاتا مگر افسانے کا بیانیہ لاشعوری سطح پر وہ پیغام اور وہ اثر چھوڑتا ہے جس کا ادراک شاید فہم اور سوجھ بوجھ سے بالاتر ہے۔

محمد علی کمیل

نیّر مسعود کے افسانے "طاؤس چمن کی مینا" کا فکری و فنی تجزیہ

نیّر مسعود اردو کے نمایاں افسانہ نگار ہیں۔ وہ ایک حقیقت پسند ادیب ہیں لیکن ان کی تحریروں کا اسلوب جادوئی حقیقت نگاری کا اسلوب ہے۔ اُن کے زیادہ تر افسانے حقیقت پر مبنی تو ضرور ہوتے ہیں مگر قاری کو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ شاید یہ خواب یا ایک سراب ہے۔ افسانے حقیقت ہوتے ہوئے بھی حقیقت نہیں محسوس ہوتے۔ شاید اس کی وجہ نیّر مسعود کا غیر انسانی چیزوں کو وضاحت سے بیان کرنے کا انداز ہے یا ان کے الفاظ کا چناؤ ہے جو مسلسل قاری کو اسی کش مکش میں رکھتا ہے کہ شاید یہ جھوٹ ہے۔ لیکن جو بھی کہا جائے، ایک بات تو طے ہے کہ، افسانے ہماری ہی دنیا کے ہیں اور یقیناً حقیقت ہیں۔ نیّر مسعود کے کئی نقادوں کا کہنا ہے کہ وہ کسی ٹائم فریم میں نہیں لکھتے اور جو وہ لکھتے ہیں وہ اس دنیا کا نہیں بلکہ کسی اور دنیا کا لگتا ہے۔ نیّر مسعود نے خود اپنے ایک انٹرویو میں اس کا ارڈّ کرتے ہوئے کہا:

> اس دنیا سے باہر کہاں جا سکتا ہے آدمی۔ یہی میں کہتا ہوں جب لوگ کہتے ہیں کہ یہ افسانہ کسی ٹائم فریم میں نہیں ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ ٹائم فریم سے آزاد ہونے کا تصور ہی نہیں کر سکتا آدمی۔ وہ الگ چیز ہے کہ یہ ہم نہ بتا سکیں کہ یہ آج کا قصہ ہے یا کل کا قصہ ہے یا برسوں پہلے کا ہے۔ لیکن ہے تو وہ بہر حال کسی نہ کسی ٹائم میں۔

نیّر مسعود کا زبان و بیان بہت سادہ اور دل کش ہے۔ ان کے افسانوں میں ایک بات نمایاں ہے کہ وہ انتہائی سادہ اردو میں لکھتے ہیں جس سے قاری پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ ان کا اسلوب ہی یہی ہے کہ وہ نثر کو نثر کے انداز میں لکھتے ہیں نہ کہ شاعری کے انداز میں۔ یہ نقطہ ان کو باقی ادیبوں سے مختلف بناتا ہے اور قاری کے لیے پڑھنا آسان۔ اس سے ایک فائدہ جو کلیّت میں افسانے کو ہوتا ہے کہ افسانہ اور زیادہ حقیقت کے قریب ہو جاتا

ہے۔ اسی طرح ان کی تحریر میں شعروں کا استعمال بہت کم یا نہ ہونے کے برابر ہے۔ جب ساگری سین گپتا نے نیّر مسعود سے انٹرویو لیتے ہوئے نثر کی قوت پر سوال کیا تو نیّر مسعود نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا:

> نثر کی قوت میرے نزدیک یہی ہے کہ اس میں شاعری سے کم کام لیا جائے۔ (میں) باقاعدہ کوشش کر کے پرہیز کرتا ہوں۔ مثال کے طور پر شعر میرے یہاں غالباً کہیں نہیں ہو گا۔

اسی زبان و بیان میں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ کسی خاص خطّے کا لہجہ بولا جا رہا ہو گا اور میرے حساب سے غالباً یہ لہجہ لکھنؤ کا ہی ہو سکتا ہے۔ اُس کی سب سے بڑی وجہ نیّر مسعود کا لکھنؤ میں پیدا ہونا، بڑے ہونا اور وہاں جوانی اور بڑھاپا گُزارنا بھی ہے۔ اس کی مثال ہمیں ان کے افسانے ''طاؤس چمن کی مینا'' میں بھی ملتی ہے۔ جیسے طاؤس چمن کا رستہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں: ''رمنون کے پاس سے ہوتا ہوا قیصر باغ پہنچا اور سیدھا طاؤس چمن پہنچا۔'' اب چوں کہ افسانے میں مقام و جگہ لکھنؤ ہے اور جس تفصیل سے بیان کیا گیا ہے یقیناً لکھنؤ کی کسی جگہ کا ذکر ہے۔

نیّر مسعود کے لکھنے کا انداز دیکھا جائے تو مصنف نے منظر نگاری کے ہنر میں مہارت حاصل کر لی ہے۔ وہ غیر انسانی چیزوں کو اس طرح سے بیان کرتے ہیں جیسے وہ کوئی کردار ہوں اور اسی وضاحت میں وہ افسانے میں سراب کا اثر بھی شامل کر دیتے ہیں۔ ایک اور بات جو قابلِ غور ہے کہ اسی وضاحت میں وہ ٹائم فریم کے بارے میں بھی مبہم اشارہ دے دیتے ہیں کہ یہ تقریباً کس وقت کا افسانہ ہے۔

''طاؤس چمن کی مینا'' نیّر مسعود کا مشہور افسانہ ہے۔ یہ افسانہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے پسِ منظر میں لکھا گیا ہے۔ افسانے کے کردار جیسے بادشاہ، وزیر علی تقی خاں، نواب احمد علی خاں، داروغہ نبی بخش یا ایجادی قفس سب تاریخی کردار ہی ہیں۔ نیّر مسعود نے اس افسانے کا پسِ منظر بیان کرتے ہوئے بتایا:

> پس منظر جو ہے اس (کہانی) کا، وہ ہے ہسٹاریکل ہی لیکن ظاہر ہے کہ اس کو تاریخی افسانے کے طور پر نہیں لکھا گیا۔

اس افسانے کے کردار غیر معمولی طور پر اصلی اور حقیقی ہیں، جیسے احمد علی خاں ایک فوٹو گرافر تھے جو ہندوستان کے پہلے فوٹو گرافر کہلائے، داروغہ نبی بخش لکھنؤ کے جانوروں کے داروغہ تھے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ دونوں جنگِ آزادی میں مارے گئے۔ نیّر مسعود کا فن یہ ہے کہ انھوں نے ایسے کرداروں کو اپنے افسانوں میں یوں ڈھالا کہ گویا وہ افسانے کے ہی کردار ہو کر رہ گئے۔

کرداروں کی بات کرتے ہوئے میں نے ایجادی قفس کا ذکر کیا جو بنیادی طور پر شعوری رو ہے اور نیّر مسعود کی فنِ کردار نگاری میں مہارت کو پیش کرتا ہے۔ ''طاؤس چمن کی مینا'' میں ایجادی قفس کا بیان ایک سے ڈیڑھ صفحے پر پھیلا ہوا ہے۔ اُن کے ہاں غیر معمولی کردار پائے جاتے ہیں۔ جس طرح منٹو زیادہ تر انسانوں کے بارے میں افسانے لکھتے ہیں، نیّر مسعود کا یہ اسلوب نہیں ہے۔ وہ غیر انسانی، بے جان کردار کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں جتنی ایک انسانی کردار کو، جیسے اس ایجادی قفس کو انھوں نے بیان کیا۔ شاید وہ منٹو کے افسانے '' سوگندھی'' میں موجود کُتے کی طرح نظر انداز کیا جاتا۔ ڈاکٹر ضیاء الحسن اسی اسلوبِ کردار نگاری پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> نیّر مسعود جب گھروں کی ایسی تفصیلات دیتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی پوری توجہ اس بیان پر مرکوز ہے۔ وہ کہانی کو فراموش کر چکے ہیں اور کہانی سے زیادہ اس بیان سے سروکار ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس بیان کے اندر سے کہانی طلوع ہوتی ہے۔ کچھ کھُلتا نہیں کہ وقوعہ اہم ہے، مکان کی تفصیلات اور مکالمے آپس میں مل کر یک جان ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو الگ کرنا ممکن نہیں رہتا۔

اسی طرح جب بھی افسانے میں اس طرح کے غیر انسانی کردار یا چیزوں کی بات ہوتی ہے تو قاری کے لیے فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ زیادہ اہمیت کس کی ہے، کہانی کے پلاٹ کی، ایجادی قفس کی یا طاؤس چمن کی مینا کی۔ مصنّف نے اس فن کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ:

> افسانے میں کردار سے مراد صرف اور صرف انسان نہیں۔ کسی بھی چیز کو کردار بنا

> کر لکھا جا سکتا ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ غیر انسانی کرداروں کو انسانی کرداروں کے تصور کا وسیلہ بنایا جا سکتا ہے۔ سمندر میں طوفان اور بیابان میں زلزلے کا بیان انسانی کردار کے تصوّر کے بغیر مکمل افسانہ بن سکتا ہے جس کے کردار ہوا، پانی، زمین وغیرہ ہوں گے۔

اگر اس افسانے کے مرکزی کردار ''کالے خاں'' کی بات کی جائے تو نیّر مسعود میں بھی مجھے منٹو کے اسلوب کی جھلک نظر آئی ہے۔ جس طرح منٹو کبھی Absolute Right اور Absolute Wrong میں یقین نہیں رکھتا اور ہر کردار کو انسانی پیمانے پر پرکھتا ہے ویسا ہی برتاؤ نیّر مسعود نے بھی اس کردار کے ساتھ کیا ہے، حالاں کہ کالے خاں میناچُرا کر کرپشن جیسے سنگین جرم میں ملوّث ہوا ہے لیکن نیّر مسعود نے ایک باپ اور بیٹی کا تعلق بہت خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے۔ مجھے کئی دفعہ یہ بھی محسوس ہوا کہ نیّر مسعود نے اپنی ساری ممتا اور باپ کا پیار اس کردار میں منتقل کر کے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے جو کہ عظیم افسانہ نگاروں کی خوبیوں میں سے ایک ہے۔

نیّر مسعود کے اسلوبِ افسانہ نگاری کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ وہ الفاظ کے معاملے میں انتہائی کفایت شعار ہیں اور بہ خوبی جانتے ہیں کہ یہی کفایت شعاری ایک افسانے اور ناول میں فرق قائم کرتی ہے۔ اس کفایتِ لفظی کا مظاہرہ کرداروں کے مکالموں میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ افسانے میں جب کالے خاں، چھوٹے میاں سے بات کر رہے ہوتے ہیں تو وہ مکالمہ ایک ایک لفظ کا بھی ہے۔ اس سے بھی کم لفظوں میں انھوں نے موجودہ صورتِ حال کی کشیدگی کو بڑی خوب صورتی سے بیان کر دیا ہے۔ اسی فن کو سراہتے ہوئے ہوئے ایک نقاد نے لکھا کہ:

> نیّر مسعود کا لکھنا، خاموشی، سیکھنا ہے۔ اور یہی وہ فن ہے جو افسانے کو ناول سے الگ کرتا ہے اور نیّر مسعود کی زندگی اور موت ہمیشہ اپنے افسانوں کی طرح غائب، مبہم اور ان کہی رہی ہے جو ان کے ادب کا بہترین آئنہ ہے۔

مبہم اور غائب اشاروں کی بات کریں تو نیّر مسعود کے تقریباً ہر افسانے میں ایسے اشارات ملتے ہیں جو کہ

ظاہر میں باطن کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ افسانہ ان کے باقی افسانوں کی نسبت بہت سادہ افسانہ ہے۔ نیّر صاحب کے الفاظ میں:

> یہ میرے لیے واقعی بہت بڑا مسئلہ ہے کہ بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ تو بھئی ایک کہانی بیان کی ہے، اس میں سمجھ میں آنا کیا۔ ایک قصہ سیدھا سادا، تو اس میں کیا پوچھنا کہ اس میں کیا ہے۔ جو کہا ہے وہ سامنے موجود ہے۔ ''طاؤس چمن کی مینا'' لکھنے کا سبب بھی بڑی حد تک یہ شکایتیں ہیں۔

اشارات میں ایک یہ اشارہ تھا کہ جب داروغہ نبی بخش بادشاہ سلامت کا پیغام لے کر آتا ہے تو پیغام کے آخر میں مکتوب میں لکھا ہے۔ ''نیز کالے خاں ولد یوسف خاں کو معلوم ہو کہ چوری اُس گھر میں کرتے ہیں جہاں مانگنے سے ملتا نہ ہو۔'' اس فرمان سے نیّر مسعود نے دوران ملازمت چوری، بد دیانتی اور بے ایمانی کو غلط کہا۔ اسی طرح ایک اور جگہ جب کالے خاں جیل سے رہائی کی روداد بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک پنجرے سے نکل کر دوسرے پنجرے میں آ گیا ہوں۔ جی چاہا لوٹ کر قید خانے چلا جاؤں۔۔۔۔'' اس پر نیّر مسعود نے ہوشیاری سے بغیر کسی سیاسی یا تاریخی پہلو پر بات کیے انگریز راج کی نفی بھی کر دی اور ایک طرح سے اُن تمام تاریخی کرداروں کو جو انھوں نے اس افسانے کے لیے چُنے، خراجِ عقیدت بھی پیش کیا۔

اگر ہم اس افسانے کو کلیت میں دیکھیں تو افسانہ دس حصّوں میں بٹا ہوا ہے لیکن پھر بھی یک جان محسوس ہوتا ہے۔ جس کی مثال ایک سیڑھی کی دی جا سکتی ہے جس کے قدم تو منفرد ہیں لیکن کلیّت میں ایک چیز ہے اور ہر قدم کو ایک رسی باندھے ہوئے نظر آ رہی ہے۔ اسی طرح سے پہلے حصے میں نیّر مسعود افسانے کی تمہید باندھتے ہیں، دوسرے اور تیسرے حصے میں پلاٹ کا الجھاؤ بیان کرتے ہیں۔ چوتھے اور پانچویں حصے میں افسانے کو نقطۂ عروج کی طرح لے کر جاتے ہیں۔ چھٹے اور ساتویں حصے میں واقعہ کے ردِّ عمل کی وضاحت کرتے ہیں۔ آٹھویں اور نویں حصے میں واقعے کے ردِّ عمل کے نتیجے میں جو اثرات کہانی یا مرکزی کردار پر ہوئے، ان کا ذکر

کرتے ہیں اور پھر دسویں حصے میں قصّے کا انجام اور اختتام بیان کرتے ہیں۔

یہ طریقہ کسی ادبی تحقیقی مقالے کا اسلوب ہے جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نیّر مسعود نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز بہ طور محقق ہی کیا تھا۔ اس چیز کا ایک فائدہ یہ ہے کہ یہ قاری کو افسانہ پڑھنے میں مدد دیتا ہے اور افسانے کو کسی بھی عام شخص کے لیے قابلِ فہم بنا دیتا ہے۔

اس سے ہمیں بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ نیّر مسعود نے اس افسانے میں پلاٹ اور تجسس کا استعمال بالکل بھی نہیں کیا۔ لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ پھر بھی آخر تک اپنے قاری کو افسانے کی کشیدگیوں میں الجھائے رکھا، جس کی وجہ سے یہ افسانہ ان کی بہترین تخلیقات میں سے ایک ہے۔ اسی اسلوب پر گپتا سین سے بات چیت میں نیّر مسعود نے کہا:

> ایک بات تو یہ ہے کہ وہ زمانہ کہانیوں کا گُزر گیا جس میں کہانی آخری جملے میں آ کر بنتی تھی۔ ایسی کہانیاں پڑھنے میں خیر دل چسپ معلوم ہوتی ہیں لیکن مجھے کبھی پسند نہیں آئیں۔

ایک ایسا نقطہ جو غیر معمولی ہے، وہ یہ کہ اس افسانے میں ایک شدید لیکن بھول جانے والی اداسی کا احساس نمایاں ہے۔ نیز مصنف نے کالے خان کے کردار میں جس بے بسی کے احساس کو اجاگر کیا ہے وہ قاری کو بھی اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ بے بسی کی اس خاموشی کو الفاظ دینا شاید کسی بھی ادب کا سب سے مشکل کام ہے، جیسے اس افسانے میں اس کے دل میں موجود ایمان داری ہمیں کبھی اُس کے وجود پر غالب تو کبھی مغلوب نظر آئی مثلاً وہ بے بسی کا عالم جب اسے مینا چوری کرنا پڑی کیوں کہ وہ بیٹی کی معصوم فرمائشوں پر بے بس تھا اور یہی بے بسی ہمیں مینا واپس کرتے ہوئے محسوس ہوئی۔ اسی طرح افسانے میں اُداسی کا عنصر بھی ہمیں دیکھنے کو ملا جس میں پہلی مثال اس کی بیوی کی ہے جس کے مرنے کے بعد اس کی اداسی اس قدر تھی کہ اپنی بیوی کی روح فلک آرا میں محسوس کرتا تھا اور دوسری اداسی تب محسوس ہوئی جب جیل سے باہر نکلتے ہی اسے اپنے پرانے ملک اور بادشاہ کی اداسی اندر سے کھاتی ہے۔

آج ادبی دنیا کے نقاد یہ تسلیم کرتے ہیں کہ نیّر مسعود منٹو جتنے بڑے افسانہ نگار ہیں اور انھوں نے اپنے تحریر کردہ افسانوں سے افسانہ نگاری کی تاریخ کو بدل دیا ہے۔ جادوئی حقیقت نگاری کے اسلوب کو اجاگر کرنا اور نقادوں اور قارئین میں اس اسلوب کے بارے شعور دینے کا تاج صرف نیّر مسعود کے سر ہے۔ یہ کہنا ہر گز غلط نہ ہو گا کہ جدید افسانہ نگاری میں نیّر مسعود ایک نمایاں افسانہ نگار ہیں۔

احمد ابو بکر

انتظار حسین کے افسانے ''زرد کُتا'' کا فکری و فنی تجزیہ

تعارف

انتظار حسین کا افسانہ ''زرد کُتا'' ایک علامتی افسانہ ہے جس میں نفسِ امّارہ کا مارا ہوا آدمی زرد کُتے کی پناہ میں آکر شرفِ انسانیت سے گر جاتا ہے۔ فن کی پیش کش کے لیے اکثر داستانوی، حکایتی، علامتی بیانیہ، قصہ گوئی اور تجریدی انداز اختیار کیا جاتا ہے مگر انتظار حسین نے اظہارِ فن کے لیے داستانوی طرز، قرآنی قصے، حکایات اور اساطیر (Myth) کا انداز اختیار کیا ہے۔ ''زرد کُتا'' میں بھی وہ معاشرتی تبدیلیوں اور اخلاقی زوال کو پیش کرتے ہیں۔ افسانے کے کردار اپنے خارج کے لیے ایک ناقابلِ برداشت زوال کا شکار ہیں اور زرد کُتے کی آغوش میں پہنچ کر شرفِ انسانیت سے گر جاتے ہیں۔

افسانے کے آغاز میں ایک لومڑی کے بچے کا ذکر ہے اور جب اس کے بارے میں راز دریافت کیا جاتا ہے تو نفسِ امّارہ کا ذکر ہوتا ہے۔ نفسِ امّارہ وہ ہے جو بدی، بُرائی اور شر کی ترغیب دیتا ہے اور تمام جھوٹ، فریب، قتل و غارت اور وسوسے اس کے طفیل ہیں۔ لومڑی کا بچہ دھوکہ بازی، چالاکی اور مکاری کی علامت ہے اور یہ بچہ بڑھ کر ایک زرد کُتا بن جاتا ہے۔ زرد کُتا بھی حرام خوری، مُردار خوری اور بے حیائی کی علامت ہے۔ اس علامتی انداز میں افسانہ نگار ہمیں معاشی، معاشرتی اور روحانی برائیوں سے بچنے کی تلقین کرتا ہے۔

پورا افسانہ مکالموں، حکایات اور تقاریر کا مجموعہ ہے۔ افسانہ نگار لکھتا ہے کہ:

> اے ابو قاسم خضری لفظ کلمہ لکھنا عبادت ہے۔

کوئی بھی بات لکھ کر یا بول کر آگے پہنچائی جاسکتی ہے۔ لہٰذا ہاتھ اور زبان کے درست استعمال پر بھی زور

دیا گیا ہے۔ یہ افسانہ مشرقی عقل و دانش اور وارداتِ عقل و قلب کا اظہار ہے۔ اس میں ماضی کے کردار اور تاریخ کے احوال کا ذکر کیا گیا ہے۔ روحانی کش مکش، مکالمے اور خطبات ایسی کیفیت پیدا کرتے ہیں کہ انسان اپنے کردار کا محاسبہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

تاریخِ عالم گواہ ہے کہ درویش، عالم، شعرا اور دانش مند اس وقت تک آزاد رہتے ہیں جب تک وہ خود کو بادشاہوں اور امرا کے دامن سے دور رکھتے ہیں۔ انسان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اس کا نفسِ امّارہ ہے جو اس کو انسانی سطح سے گرا کر حیوانی سطح پر لے آتا ہے۔ افسانہ نگار نے حکایات کا سہارا لے کر اسی انسانی زوال کی بات کی ہے۔

سجاد باقر رضوی آخری آدمی کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> زرد کُتا نفسِ امّارہ کے حوالے سے فرد کی روحانی زندگی کے انحطاط کی کہانی ہے مگر یہ بات معاشرتی انحطاط کی وجہ بھی بن جاتی ہے۔

''زرد کُتا'' انسانی نفس کی پستی اور ذلّت کا استعارہ ہے۔ انتظار حسین کے نزدیک یہ افسانہ اس لیے پُرکشش تھا کہ اس میں صوفیائے کرام کے مکاشفوں کا تذکرہ ہے۔

افسانے کا فنی جائزہ

اس افسانے کا فنی جائزہ لیتے ہوئے ہم اس کے عنوان، پلاٹ، کردار، مکالمے، زبان، فصاحت و بلاغت، دیگر زبانوں کا استعمال اور علمِ بیاں کا تذکرہ کریں گے۔

افسانے کا عنوان

انتظار حسین نے اپنے افسانے کا عنوان بہت گہرے مشاہدے اور غیر معمولی ذہانت کو بروئے کار لاتے ہوئے رکھا ہے۔ ایک لفظ ''زرد کُتا'' کے ساتھ پوری کہانی کا نچوڑ بیان ہو جاتا ہے۔ زرد کے لغوی معنی ہیں پیلا۔ زرد کُتا ایک علامتی انداز میں استعمال ہوا معلوم ہوتا ہے اور جب قاری اس کا بہ نظرِ عمیق جائزہ لیتا ہے تو گویا محسوس ہوتا ہے جیسے یہاں زردی کا تعلق بیماری کے ساتھ ہے اور کُتے کا تعلق حرص، ہوس، حرام خوری اور بے

شرمی و بے حیائی کے ساتھ ہے۔ بالفاظِ دیگر زرد کُتا گندگی کی علامت ہے۔ اس عنوان سے انسان کی توجہ اس کی جانب راغب ہوتی ہے قاری اس کو پڑھنے کا ارادہ کرتا ہے۔ ذاتی سطح پر افسانے کا انتخاب کرتے وقت بھی ''زرد کُتا'' کے عنوان نے اپنی انفرادیت کی بہ دولت میری توجہ حاصل کی۔

افسانے کا عنوان، افسانے میں موجود حالات و واقعات اور سبق کا عکس ہے۔ وہ کتا ہی تو ہے جو راہِ راست سے بھٹکاتا ہے۔ میرے ذہن میں ایک مزاحیہ مگر اہم مثال آتی ہے کہ اگر انسان پیدل یا سائیکل پر سفر کر رہا ہو تو کتا اس کے پیچھے دوڑتا ہے اور اکثر لوگ اس کے باعث اپنا رستہ بدل لیتے ہیں، یعنی اپنے راستے سے بھٹک جاتے ہیں۔ لیکن دوسری جانب اگر کوئی موٹر کار پر سوار ہو تو کتا جتنا بھی بھاگ اور بھونک لے موٹر کار والے پر اثر نہیں ہوتا کیوں کہ وہ چھت اور کھڑکیوں سے محفوظ ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر انسان کا دل مطمئن اور پرہیز گار ہو تو وہ موٹر کار کی مانند کُتے سے محفوظ ہوتا ہے۔

پلاٹ کا جائزہ

اس افسانے کا پلاٹ ایسے مکالموں، حکایات و واقعات کا سلسلہ ہے جو ایک وسیع بیانیہ کی شکل اختیار کرتا ہے جس میں ہر مکالمہ ایک واقعہ کا سبب بنتا ہے۔ یہ افسانہ اسباب و اثرات کا مجموعہ ہے۔ افسانے کا آغاز ایک عجیب سی حکایت سے ہوتا ہے اور اس کے بعد اس کی تفسیر دی جاتی ہے اور لفظ ''زرد کُتے'' کا استعمال کیا جاتا ہے۔ افسانے میں پہلے اس بات کو بیان کرنے پر زیادہ توجہ دی گئی ہے کہ زرد کُتا کیا ہے اور اس کے بعد زرد کُتے کے اثرات اور اس کو مار بھگانے کے جتن کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

افسانے میں جو واقعات، حکایات اور مکالموں کا مجموعہ ترتیب دیا گیا، ان کی تاریخی اہمیت افسانے کے حسن کو چار چاند لگا دیتی ہے اور قاری کی توجہ ٹوٹنے نہیں دیتی۔ ادبی اعتبار سے یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ اس افسانے کا پلاٹ منظّم ہے۔

کرداروں کا جائزہ

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اس افسانے میں صرف ایک ہی کلیدی کردار ہے اور وہ ابو قاسم خضری کا ہے۔ یہ افسانہ ابو قاسم خضری کے شیخ اور ان کے بیعت داروں اور ان کی نفسانی کیفیت کے گرد گھومتا ہے۔ افسانے میں کسی بھی زنانہ کردار کا تذکرہ نہیں ہے ماسوائے رقاصہ کے، جس کے جسم کی معمولی سی منظر کشی کی گئی ہے تاکہ افسانے کا عرق دریافت کرنے میں آسانی ہو۔ اس کے علاوہ افسانے میں ایک کُتے کا کردار بھی ہے جو بسا اوقات ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی جسمانی حالت میں موجود ہے۔ تاہم وہ ایک مثالی کردار ہے اور اصل مقصد کُتا نہیں بلکہ اس سے جُڑی خصوصیات کا ذکر ہے۔ افسانے کا کلیدی کردار معاشی طور پر پسماندگی کا شکار ہے اور اس کا تذکرہ کرنا اس لیے لازم ہے کیوں کہ نفس لوامہ کی بوٹی اس کے بھوک سے ستائے ہوئے پیٹ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

انتظار حسین اپنے کرداروں میں بوڑھوں کا ذکر کم کرتے ہیں کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ بوڑھوں کی ڈھلتی عمر، ڈھلتی ہوئی تہذیب کی مانند ہے۔ دوسری جانب انتظار حسین کا یہ بھی خیال تھا کہ کردار ہمیشہ مشاہدے سے نہیں، بلکہ تخیل سے جنم لیتے ہیں اور اس افسانے کے کردار معلوم ہوتا ہے جیسے تخیل کی ہی پیداوار ہوں۔ اس قدر گہرے کردار، مشاہدے کے باعث پیدا ہونا مشکل معلوم ہوتے ہیں۔

مکالموں کا جائزہ

افسانہ درحقیقت مکالمات اور واقعات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ افسانے کے مکالمات بہت پیچیدگی سے تشکیل دیے گئے اور ان کی تعمیر کے دوران بات برائے بات اور تفسیر برائے سوال وجواب کا عنصر نظر آتا ہے۔ انگریزی ادب میں اس کے لیے Coherence کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مکالموں کا تمہیدی اور اختتامی منظر نامہ کچھ یوں پیش کیا گیا ہے کہ زمان و مکاں کی مکمل تفہیم ہوتی ہے اور کرداروں کے نام لیے بغیر ہی معلوم ہوتا ہے کہ کس نے کیا کہا۔

زبان

افسانے کی زبان عمدہ اور آسان ہے۔ مصنف نے اختصار پسندی سے کام لیتے ہوئے الفاظ کو موتیوں کی طرح پرو دیا ہے۔ اردو ادب کے کچھ پیچیدہ الفاظ کا بعض مقامات پر تذکرہ ہے لیکن افسانے کا سیاق ان کے معنی بیان کر دیتا ہے۔ افسانے میں کسی بھی قسم کی متضاد زبان استعمال نہیں کی گئی، البتہ استعاروں اور تشبیہات کا استعمال ملتا ہے۔

علمِ بیان اور دیگر زبانوں کے الفاظ کا استعمال

افسانہ نگار نے اس افسانے میں استعارے کا بہت استعمال کیا ''زرد کُتا'' بھی ایک استعارہ ہے۔ اس کا مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ جو دراصل انسان کا نفسِ امارہ ہے جو کہ ہوس کے رستے پر بڑھتا جاتا ہے۔ اسی طرح واقعات سے اور حکایات سے تشبیہ کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے جو ایک منظّم انداز میں افسانے کا پلاٹ ترتیب دیتا ہے۔

افسانے میں فارسی زبان کے الفاظ کا استعمال ہوا مگر ان کا مطلب واضح نہیں کیا گیا۔ چوں کہ فارسی زبان کی اردو زبان کے ساتھ تھوڑی سی مماثلت ہے تو کچھ الفاظ سے مفہوم اخذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان الفاظ کی تعداد چوں کہ تھوڑی ہے اس لیے یہ افسانے کے معیار پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ لیکن فنی اعتبار سے معنی اور مفہوم کا تقاضا ضرور کرتے ہیں۔

فکری جائزہ

افسانے کے فکری جائزے میں ہم افسانے کے موضوع، مصنّف کے عہد و معاشرے اور اس کے افسانہ نگار پر اثرات کے ساتھ ساتھ قاری کو حاصل ہونے والے سبق، مقصدیت اور موجودہ زمانے میں فن پارے کی اہمیت کا تذکرہ کریں گے۔ انتظار حسین کے افسانے باذوق سماعتوں اور روشن آنکھوں کے لیے ہمیشہ سے ہی ایک نگینہ رہے ہیں۔

مصنف کی سوچ کا احاطہ

اس افسانے کا موضوع بہت گہرا ہے۔ یہ بات بھی دیکھی گئی ہے کہ جو چیز جتنی گہری ہوتی ہے کم الفاظ میں اپنا مفہوم دے جاتی ہے۔ اگر زاویوں کی تلاش کی جائے تو اس افسانے کا موضوع وسیع تر ہوتا جاتا ہے لیکن اس کا سب سے اہم سبق نفسِ امّارہ پر قابو پانا ہی ہے۔ اگر انسان نفسِ امّارہ پر قابو نہیں پاتا تو وہ ایک زرد کُتے کی مانند بڑا ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان کو مکمل طور پر اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور انسان اس دلدل سے باہر ہی نہیں آسکتا۔

افسانہ نگار کا طرزِ نگارش مذہبی ہے۔ وہ دو ہی دنیاوی موضوعات پر لکھتے ہیں۔ یا تو انسان کا روحانی و اخلاقی زوال یا پھر اپنی تہذیبی شخصیت کی تلاش۔

سجاد باقر رضوی اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

> انتظار حسین نے دنیاوی موضوعات میں انسان کے روحانی و اخلاقی زوال اور اپنی تہذیبی شخصیت کی تلاش کے بارے میں لکھا ہے۔ وہ اس خیال سے آزاد تھے کہ آدمی بنیادی طور پر نیک اور آزاد پیدا ہوا ہے اور معاشرے نے اسے بدنما بنا دیا ہے۔

اکثر افسانہ نگاروں کی عادت ہے کہ وہ بہ ظاہر نیک کردار والوں میں بدی اور بہ ظاہر بد کرداروں میں نیکی کی تلاش کرتے ہیں اور اس انکشافِ حقیقت کی تلاش پر پورا افسانہ لکھ دیتے ہیں لیکن انتظار حسین کے افسانوں میں انسان بدی کی طرف مائل نظر آتا ہے اور بُرائی کی طرف مائل ہوتے ہی سب انسان برابر ہو جاتے ہیں۔

مصنف کا زمانہ

انتظار حسین نے جس زمانے میں آنکھ کھولی تب مسلمان اور ہندو ایک قوم کی طرح رہتے تھے اور مسلمانوں نے بہت سی اقدار ہندوؤں سے سیکھی تھیں۔ ان کی تحریروں میں بدھ مت کا اور مہابھارت کا عکس نظر

آتا ہے۔ ان کی لکھت میں انجیل سے متاثر ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ انتظار حسین کے افسانے میں کافکا سے مشابہت بھی نظر آتی ہے۔ انتظار حسین نے تقسیم پاکستان کے بعد مُلّا کے بارے میں بہت لکھا اور اکثر افسانوں میں ان کا عکس نمایاں ہے۔

سبق

انتظار حسین کے افسانے اکثر سبق آموز ہوتے ہیں اور اس افسانے ''زرد کُتا'' میں تو ہر حکایت ہی ایک سبق کی مانند ہے۔ مصنف اپنے قاری کو نفسِ مطمئنہ تک رسائی کا طریقہ بیان کرتا ہے۔ بات بے شک استعاروں کی صورت میں ہوتی ہے لیکن سبق ملتا ہے کہ انسان اپنے نفسِ امّارہ کو مار کر نفسِ لوامہ پیدا کرے اور پھر اپنے کردار کو اس قدر مضبوط کرے کہ وہ نفسِ مطمئنہ بن جائے۔ یہ نفسِ امّارہ سے نفسِ مطمئنہ تک کا سفر انسان کو حیوانی درجے سے اٹھا کر حقیقی معنوں میں انسان بناتا ہے۔ گوپی چند نے اپنی کتاب انتظار حسین اور ان کے افسانے میں انتظار حسین کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے اردو افسانے کو نئے معاشیاتی امکانات سے آشنا کیا اور اردو افسانے کا رشتہ بہ یک وقت داستان، حکایات، مذہبی روایتوں، قدیم اساطیر اور دیومالا سے ملا دیا ہے۔ ان کا اندازِ نگارش ان کو اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں سے ماورا بناتا ہے اور ان کا قاری ان کے افسانے سے خاصا متاثر ہوتا ہے۔

مقصدیت

انتظار حسین کے افسانوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ ان میں ایک مقصد پوشیدہ ہوتا ہے اور وہ مقصد انسانی معاشرے کی اصلاح ہے۔ افسانے ''زرد کُتا'' کا مقصد بھی معاشرے کی اصلاح تھا اور انتظار حسین نے بہ خوبی اس مقصد کو پورا کیا ہے۔ خالدہ ظفر اپنے تجزیے میں کہتی ہیں:

> انتظار حسین کا مقصدِ نگاری ایک خاص حد تک معاشرے کی اصلاح تھا اور انھوں نے اپنے افسانے ''زرد کُتا'' اور ''آخری آدمی'' میں کمال کے فنِ مقصدیت کو اجاگر کیا ہے۔ اگر کوئی افسانہ پڑھے جاتے وقت آنکھیں بھر دے یا پھر اپنے قاری

پر وہ گہرا اثر چھوڑ دے جو کہ افسانہ نگار پہنچانا چاہتا تھا تو اس افسانے کا مقصد پورا ہو گیا۔

فن پارے کی موجودہ دور میں اہمیت

انتظار حسین نے افسانہ ''زرد کُتا'' ۱۹۸۰ء میں لکھا۔ تب سے لے کر آج تک اس افسانے کے اثر میں ذرا سی بھی کمی نہیں آئی۔ شمیم حنفی اپنی تحریر انتظار حسین - ایک ادھوری تفسیر میں لکھتے ہیں کہ انتظار حسین کے افسانے ہر زمانے کے لیے اہمیت کے حامل ہیں۔ جو بھی جس زمانے میں بھی اس افسانے کو پڑھے گا وہ ایسا محسوس کرے گا کہ گویا یہ افسانہ اسی کے لیے ہی لکھا ہو۔

افسانہ ''زرد کُتا'' کا مطالعہ کرتے ہوئے میری آنکھیں نم ہو گئیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابو قاسم خضری کا کردار گویا میرا کردار ہے اور میں وہ شخص ہوں جو دریا کنارے بیٹھا اپنے رب سے آہ و زاری اور منت سماجت کر رہا ہو۔ یہ اس بات کا پختہ ثبوت ہے کہ انتظار حسین کا افسانہ آج بھی زندہ ہے اور آنے والے زمانوں میں بھی زندہ رہے گا۔

فرحان سلیم

دو چشمی ''ھ'' اور ''ہ'' کا استعمال

''ھ'' اور ''ہ'' میں کیا فرق ہے؟

''ھاں'' اور ''ہاں'' کیا دونوں ٹھیک ہیں؟ اسی طرح ''ھم'' اور ''ہم'' اگر فرق ہے تو کیا ہے؟

اردو میں دو چشمی ھ کا استعمال مرکب حروف تہجی بنانے کے لئے ہوتا ہے۔ مثلاً: بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، گھ، اور لھ وغیرہ۔ بعض جگہوں پر خوب صورتی یا کسی اور وجہ سے لوگ ابتدا میں ''ھ'' کا استعمال کرتے ہیں مثلاً ''ھم''، ''ھماری'' اور ''ھاں'' وغیرہ۔

لیکن یہ استعمال درست نہیں ہے۔ اول تو یہ کہ اردو میں ''ھ'' ابتدائے لفظ میں کبھی آ ہی نہیں سکتا، کیوں کہ دو چشمی ''ھ'' کی اکیلی مستقل آواز نہیں ہے بلکہ اسے کسی دوسرے حرف کے ساتھ ملا کر لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ دو چشمی ھ اردو میں چند حروف کے ساتھ ہی آسکتی ہے، اردو کے تمام حروف تہجی کے ساتھ نہیں آسکتی مثلاً: بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، گھ، اور لھ وغیرہ۔ اس کے علاوہ باقی حروف کے ساتھ دو چشمی ''ھ'' نہیں آتی، جب کہ ''ہ'' کی الگ مستقل آواز ہوتی ہے۔

ذیل میں ''ہ'' اور دو چشمی ''ھ'' کے چند جملے لکھے جا رہے ہیں، انہیں پڑھ کر آپ کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ ان دونوں کے پڑھنے میں کیا فرق ہے اور اُردو زبان میں یہ دو مختلف ہ / ھ الگ الگ کیوں رائج ہیں:

''ھ'' بھ: ننھے منے بچے سب کے من کو بھاتے ہیں۔

''ہ'' بہ: لاپرواہ لوگ پانی زیادہ بہاتے ہیں۔

"ھ" پھ: بچے نے کاپی کا صفحہ پھاڑ دیا۔

"ہ" پہ: پہاڑ پر چڑھنا ایک دشوار کام ہے۔

"ھ" تھ: میرا ایک دوست تھائی لینڈ میں رہتا ہے۔

"ہ" تہ: ابھی تک صرف ایک تہائی کام ہوا ہے۔

"ھ" ٹھ: ان دونوں کی آپس میں ٹھنی ہوئی ہے۔

"ہ" ٹہ: درخت کی ٹہنی پر چڑیا چہچہا رہی ہے۔

"ھ" جھ: آج فضا بوجھل سی ہے۔

"ہ" جہ: ابوجہل اسلام کا سخت دشمن تھا۔

"ھ" چھ: ڈاکٹر نے مریض کے جسم سے گولی کا چھرّا نکال دیا، یا جانور کے گلے پر چُھرا پھیر دو۔

"ہ" چہ: اس کا چہرہ خوشی سے کِھلا پڑ رہا تھا۔

"ھ" دھ: یار میرا دھندہ خراب مت کرو۔

"ہ" دہ: وہ اس کا نجات دہندہ بن کر آیا۔

"ھ" ڑھ: میرے گھر کے آگے ڈم ڈم کی باڑھ لگی ہوئی ہے۔

"ہ" ڑہ: میرے گھر کے پاس بھینسوں کا باڑہ ہے۔

"ھ" کھ: میرا قلم کھو گیا ہے۔

"ہ" کہ: ہاں اب کہو! کیا کہنا چاہ رہے تھے۔

"ھ" گھ: جنگلات میں گھنے درخت ہوتے ہیں۔

"ہ" گہ: اس نے اپنی شادی پر گہنے اور دیگر زیورات پہنے ہوئے تھے۔

یہ جملے صرف دو چشمی "ھ" اور "ہ" کے آپس میں فرق واضح کرنے کے لیے بہ طور مثال لکھے ہیں، اُمّید ہے آپ ان سے مستفید ہوں گے۔

عبدالحلیم عالم

زگر آباد کی کہانی*

یہ اُن دنوں کی بات ہے کہ سرکارِ قبلہ نے ایک قانون منظور کروایا جس میں زگر آباد کے کچھ علاقوں کو خود مختاری دی گئی۔ یہ خود مختاری مذہب کو دی گئی۔ تمام مذہبی جماعتوں کو یہ اختیار دیا گیا کہ جو کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔

پھر ہم نے دیکھا کہ زگر آباد میں جماعتیوں کا بول بالا ہو گیا۔ بلا وجہ لوگوں کے سر قلم کر دیے جانے لگے۔ مساجد میں واعظ لاؤڈ سپیکر پر لوگوں کو دعوت دینے لگے۔ یہ واقعہ ہے زگر آباد کا جہاں لوگ جوق در جوق ریلیوں کی شکل میں ایک علاقے سے دوسرے علاقے آ، جا رہے تھے اور بلند آواز سے نعرہ لگا رہے تھے "فتح یاب فتح یاب"۔ یہ ریلیاں بوڑھوں، جوانوں، بچوں اور مردوں پر مشتمل تھیں۔ گوتم زگر آباد کے ایک سکول کا ماسٹر تھا اور سکول کے سرکاری کوارٹر میں رہائش پذیر تھا۔ اس نے دیکھا کہ پچھلے دو ہفتوں سے وہاں ہر گلی، ہر محلے اور ہر سڑک پر ریلیاں ہی ریلیاں نظر آ رہی ہیں۔ گوتم کا ایک ہم پیشہ کمال جو رات کو چائے پینے گوتم کے پاس آتا تھا دونوں بیٹھ کر ایک دوسرے کو اپنی شاعری سناتے تھے اور ادب پر لمبی گفتگو کرتے تھے مگر اب سب کچھ ملتوی ہو گیا۔ ڈر اور خوف کی وجہ سے رات کو باہر نکلنا محال ہو گیا۔ یہ سلسلہ دن بہ دن بڑھتا گیا۔ گوتم کو ان واقعات سے تکلیف ہونے لگی مگر ہمت نہیں ہوئی کہ احتجاج کرے۔

کچھ دن گُزرنے کے بعد جلسے جلوس زور و شور کے ساتھ بڑھتے گئے اور اب اُن کے نعروں میں کچھ نئے

---

* ہم نے ڈاکٹر ناصر عباس نیّر سے قرۃ العین حیدر کے ناول آگ کا دریا کے عنوان سے کورس پڑھا۔ ٹرم پیپر کے طور پر ہم سے کہا گیا کہ ہم آگ کے دریا کی کہانی کو آگے بڑھائیں، یعنی جہاں آگ کا دریا ختم ہوتا ہے اس کے بعد کی کہانی ناول کے کرداروں کے ذریعے لکھیں۔ میں نے یہ کہانی لکھی۔

نعرے بھی شامل تھے۔ گوتم کو یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ لوگ کس طرح ہجوم کی شکل میں طاقت ور ہوتے جا رہے ہیں۔ دن گُزرتے گئے اور جلوس بڑھتے گئے۔ ہجوم کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اب گوتم نے کلاس میں صرف اپنا کورس پڑھایا، طلبا کو فلسفہ، ادب اور مذہبی بحثوں سے دُور رکھا۔ گوتم ایک نوجوان تھا اور ماسٹر لگ چکا تھا۔ اس کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اس نے تمام سماجی علوم پڑھے تھے۔ وہ ہمیشہ بحث کرتا ہوا نظر آتا لیکن جماعتیوں کا ڈر اس قدر بڑھا تھا کہ اب وہ صرف خود سے بحث کرنے لگا۔

یوں ہوا کہ کچھ دن بعد جماعت نے یہ اعلان کر دیا کہ اب بھی وقت ہے اگر زگری مسلمان ہونا چاہیں تو ہو سکتے ہیں ورنہ پھر ہم جلد یہ اعلان کرنے والے ہیں کہ اب کوئی بھی غیر مسلمان کلمہ پڑھ کر مسلمان نہیں ہو سکتا۔ پھر ہم وہ تمام گھر جلائیں گے جو مسلمانوں کے نہیں ہیں۔

حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ ہر جگہ خوف و ہراس کا سماں ہو گیا۔ سڑکوں پر لوگ احتیاط سے جانے لگے۔ ہسپتالوں میں جانے سے لوگوں نے گریز کیا، کیوں کہ شفا دینے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔ سکولوں کی جگہ مدرّسے کی آبادی بڑھ گئی۔ مسجد میں نمازیوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ وضو کے لیے پانی بھی نہ بچ سکا۔ مسجد تعمیر کرنے والے کو جنت کے ٹکٹس دیے گئے۔

گوتم اب سرکاری کوارٹر میں رہنے کی بجائے کمال کی بیٹھک میں رہنے لگا۔ اس کے دل میں جماعت کا خوف بڑھنے لگ گیا تھا۔ اب وہ سارا دن گُم صُم تھا۔ اس نے کچھ کرنا چاہا مگر کوئی ساتھی نہیں تھا۔ پھر وہ دن بھی آ گیا کہ جماعت کا امیر ساتھیوں سمیت گشت پر نکلنے لگا۔ ھمک میتگ (ہر گاؤں) میں جا کر وہ زگری ڈھونڈتے گئے اور بہ زور بندوق اُن سے اسلام قبول کروانے لگے۔ جو کہتے کہ ہم پہلے سے مسلمان ہیں بس ہمارا فرقہ الگ ہے تو اُن کو مار دیتے۔ مارنے والے کو ۷۲ حوروں کی بخشش دے دیتے تھے۔ یوں بہت سے لوگ مارے گئے۔ بہت سوں کو اسی فرقے کا مسلمان بننا پڑا۔ کچھ بے چارے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔

خوف نے اب سب کو ذہنی مریض بنا دیا تھا۔ خاموشی کی فضا پھیلتی گئی۔ زباں کھولنے کی سزا موت مقرر ہو گئی۔ امیر کی شان و شوکت بڑھتی گئی۔ ہر دن کوئی نہ کوئی واقعہ ہونے لگا۔ عورتوں پر اتنی پابندی عائد کی گئی کہ

خودکشی کے سوا کوئی راستہ ہی نہیں بچا۔

ایک رات گوتم بیٹھ کر اگلی کلاس کی تیاری کر رہا تھا دُور سے شور کی آوازیں آنے لگیں۔ گوتم نے باہر جھانک کر دیکھا مگر اندھیرے کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آیا اور وہ دوبارہ مصروف ہو گیا۔ لیکن جب کمال دیر سے گھر آیا تو بہت گھبرایا ہوا تھا۔ وہ آکر بیٹھک میں بیٹھ گیا اس کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ گوتم نے اسے پانی پلایا۔ اُس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا مگر وہ خاموش تھا۔ گوتم نے اُس کے من کو بھانپ لیا اور پوچھا۔ ''بتا! کیا ہوا ہے؟'' اس کے بارہا اصرار کرنے پر بتانے لگا کہ ''ابھی ایک ریلی نے جا کر امیرہ کو بچوں سمیت ہلاک کر دیا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ بہت تڑپ رہی تھی۔ وہ بھاگ رہی تھی۔ مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ مگر سب نامرد کھڑے ہو کر تماشا دیکھ رہے تھے۔ کسی نے بھی ہمّت نہیں کی۔۔۔ اور میں؟ میں پہنچ۔۔۔ وہ کہتے کہتے رُک گیا اور اُس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔''

گوتم دنگ رہ گیا۔ مگر اسے پتہ نہیں تھا امیرہ کون ہے۔ اس کے پوچھنے پر کمال نے بتایا۔

''ایک زگری بوڑھی عورت جو پچھلے دس سالوں سے یہاں مقیم تھی''۔ وہ کہتے کہتے رُک گیا۔

گوتم نے افسوس کا اظہار کیا۔ اور پھر پوچھا: ''اُس کے شوہر۔۔۔ کیا بچوں کو بھی مار ڈالا؟''

''ہاں! بچوں تک کو نہیں چھوڑا۔۔۔ شوہر تو اُس کا وفات پا گیا تھا اور وہ خود بچوں کی کفالت کر رہی تھی۔'' اُس نے غصے سے جواب دیا۔ پھر وہ اِک دم خاموش ہو گیا۔

اُس نے سانس لیا اور کہنے لگا: ''جب میں وہاں پہنچا تو اُس کا گھر جل رہا تھا۔ وہ دونوں بچوں کا ہاتھ پکڑ کر بھاگ رہی تھی۔ اُس کے بچّے سہمے ہوئے تھے اور وہ چلّا رہی تھی۔ اُس کی آواز گرج رہی تھی۔ وہ میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ بچاؤ بچاؤ کہہ رہی تھی۔ مگر مجھ سمیت سب نامرد بس نظارہ دیکھ رہے تھے۔

گوتم: ''وہ کون لوگ تھے؟''

اس سوال پر اس نے برہمی کا اظہار کیا اور کہنے لگا۔ ''تم بھی عجیب سوال پوچھتے ہو۔ کیا تمھیں پتہ نہیں وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ تمھاری آنکھوں میں جو ڈر ہے یہ مزید اُن کی طاقت بن سکتا ہے۔۔۔ میں نے جب اُن

کو دیکھا تو اُن کے چہرے غضب ناک تھے۔ لمبے بال، بڑی بڑی مونچھیں اور ہاتھ میں سرخ رنگ کے جھنڈے تھے۔ بندوقیں ہاتھ میں تھیں۔ جب وہ گھر جلا رہے تھے تو بلند آواز میں نعرہ تکبیر بلند کر رہے تھے۔۔۔ میں کیا بولوں اب۔'' وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور پنکھا تیز کرنے لگا۔

گوتم ساری رات یہ سوچ رہا تھا کہ امیرہ کو کون دفنائے گا۔ کیا اس کی لاش کو جلا دیا جائے گا یا پھر جانوروں کو کھلا دیا جائے گا۔

اب کافی رات جا چکی تھی اور گوتم اکیلا بیٹھ کر سوچ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ کبھی اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اب یہ علاقہ رہنے کے قابل ہی نہیں ہے مجھے تبادلہ کروانا چاہیے، مگر پھر سوچتا کہ ان بچوں کا کیا ہو گا؟ کئی خیالات اس کے ذہن میں آتے گئے مگر گوتم کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے نیند اُڑ چکی تھی اور خوف اس کے وجود کا حصّہ بن گیا تھا۔ طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن میں جنم لے رہے تھے۔ مذہب سے اسے نفرت سی ہونے لگی۔ مذہبی جماعتوں پر شدید غصّہ آنے لگا۔ لیکن وہ کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ اگلے دن گوتم کمال کی بیٹھک سے نکل کر جانے لگا تو اسے خیال آیا کہ اس کے شاگردوں کا کیا ہو گا۔ وہ دوبارہ سرکاری کوارٹر میں چلا گیا۔

کچھ سال بعد زگر آباد کی مذہبی جماعتیں کم زور ہو گئیں اور اب مزن گردن (طاقت ور / ظالم) کی آمد و رفت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ سارا علاقہ اُن کے قبضے میں آ گیا۔ ہر دس کلو میٹر بعد ایک چیک پوسٹ قائم کی گئی اور دلیل یہ دی گئی کہ علاقے کے امن و امان کو خطرہ ہے اسی لیے ہم علاقائی میر و نواب کے ساتھ مل کر امن قائم کریں گے۔ میر و نواب اب چھاؤنی کے عزیزانِ خاص ہو گئے اور سیاہ کانچ (کالے شیشے) گاڑیوں میں دن رات چھاؤنی کا گشت کرتے رہے۔ اُن کو خاص سرپرستی حاصل تھی وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ جب چاہیں کسی کا قتل کریں، جب چاہیں کسی کے گھر پر قبضہ کر لیں اور جب چاہیں شریف النفس لوگوں کو تنگ کریں۔ زگر آباد کے غیرت مند لوگ اب اُن کی ان حرکات سے تنگ آ چکے تھے اور نقل مکانی کا سوچ رہے تھے مگر کوئی سہارا نہیں تھا۔

گوتم اب کتابوں سے دُور ہو چکا تھا وہ دن رات خلوت میں تھا۔ شاید خلوت ہی اس کا واحد سہارا تھا جو اسے کہیں نہ کہیں خود سے آشنا کرتا۔ اب وہ زگر آباد کے پہاڑوں پر جا کر کہتا کہ یہ پہاڑ مجھے جانتے ہیں۔ ان کو میرا نام یاد ہے اور یہ میری زمین کے اصل محافظ ہیں اور میں انھی سے پناہ مانگتا ہوں۔ کبھی وہ ساحلِ زگر آباد پر جا کر یہ کہتا کہ میں اب سمندر کو قید ہونے نہیں دوں گا۔ یہ لہریں آزاد ہونا چاہتی ہیں اور مزن گر دن اس کی لہروں کو قفس کرنا چاہتے تھے جو کہ گوتم کے وجود کو متزلزل کرتا۔ ساحلی علاقوں میں اب باقاعدہ چیکنگ ہونے لگی اور ایک دن گوتم کو کسی سپاہی نے گھنٹوں تک دھوپ میں کھڑا کیا اور اُن سے خاموش رہنے کو بولا گیا۔ آخر یہ معلوم ہوا کہ شام کو ایک شاہی افسر بیوی بچوں سمیت سیر سپاٹے کے لیے تیاب (سمندر کے کنارے) پر آرہے ہیں اسی لیے جب تک وہ واپس نہیں ہوں گے یہ تمام لوگ یہاں اسی طرح کھڑے رہیں۔

اگلے دن گوتم کمال سے ملنے گیا جہاں پہلے سے چمپا جام، شنکر بز نجو اور طلعت رند موجود تھے۔ گوتم نے جھک کر سلام کیا اور ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ کمال نے گوتم کا تعارف کرایا اور پھر ایک دوسرے سے باتیں ہونے لگیں۔

چمپا جام: ''تو آپ ہی ہو گوتم جس کا چرچا زگر آباد کے ادبی حلقوں میں ہوتا ہے۔ آپ کے اشعار سنے بہت اچھے ہیں لیکن۔۔۔''

گوتم کو اب بات کرنے کا موقع ملا تھا تو اس نے چمپا کی بات کو پُورا ہونے نہ دیا اور کہا: ''میں تو ادب پڑھاتا تھا اور کبھی کبھار کچھ اشعار کہتا تھا مگر اب نہ ادب رہا نہ ادبی حلقے''۔

طلعت نے دوپٹہ سیدھا کیا اور پوچھا: ''کیوں؟ ابھی بھی مشاعرے تو ہوتے ہیں''۔

گوتم نے سنجیدگی سے کہا: ''مشاعرے تو ہوتے ہیں مگر ادبی نہیں بلکہ سرکاری ہیں۔ مجھے انقلابی کہہ کر منع کیا جاتا ہے اور یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ میں نوجوانوں کے ذہنوں کو خراب کرتا ہوں اور انھیں انقلاب کا درس دیتا ہوں۔ میری تنخواہ اب بند کر دی گئی ہے کیوں کہ سرکارِ قبلہ مجھ سے ناراض ہے''۔

کمال نے چادر سے کمر زانی لگایا (بلوچ ٹیک لگانے کے لیے گھٹنوں اور کمر سے چادر باندھ لیتے ہیں) اور کہا: ''گوتم! مجھے

لگتا ہے تمہارا باغی ہونے کا ارداہ ہے۔ کل ہوٹل میں لوگ آپس میں گفتگو کر رہے تھے کہ گوتم سرکارِ قبلہ سے ناراض ہے اور ہمیشہ گڑبڑ سی باتیں کرتا ہے"۔

چمپا نے طنزاً کہا: "دیکھو گوتم! میں نے کل بڑوں سے سُنا ہے کہ سرکاری دفتر میں آپ کے متعلق باتیں کی جارہی ہیں کہ آپ کا کچھ کیا جائے۔ آپ انقلابی باتیں کرتے ہو اور جوانوں کو ورغلا رہے ہو۔ میں مانتا ہوں کہ سرکاری محافظ ہماری چیکنگ کرتے ہیں لیکن آپ کو بھی معلوم ہے کہ زگر آباد کے دشمن بار بار اس علاقے کے امن کو خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ یہ ہمارے لیے ہی رات بھر پہرا دیتے ہیں"۔

گوتم: "کیسی باتیں کرتے ہو چمپا جی! مانا کہ آپ کے بڑے زگر آباد کی پارلیمانی سیاست میں حصّہ لیتے ہیں اور انھیں سیاست کی سمجھ بوجھ ہے لیکن آپ کی یہ باتیں سن کر مجھے تعجب ہوتا ہے۔ بھلا کیسے اجنبی سپاہی میرا محافظ بن سکتا ہے جو مجھے اپنے گھر جانے نہیں دیتا۔ جو مجھے آزادی سے گھومنے نہیں دیتا۔ یہ پہاڑ برسوں سے ہمیں جانتے ہیں اور کبھی بھی انھوں نے یہ زمین تنگ نہیں کی ہے تو آج کیسے وہ ہمارے لیے خطرہ بنے ہیں۔ یہ سمندر جس نے حمل کو جنم دیا تھا اور صدیوں پہلے اس نے مزاحمت کر کے پرتگیزیوں کو بھگایا تھا آج اسی سمندر کو مجھ سے چھینا جارہا ہے۔ کیا میں پاگل ہوں؟ زگر آباد میں نمازی اور زگری جو برسوں سے زگر آباد کے باسی ہیں وہ کیسے آپس میں مل کر نہیں رہ سکتے۔ کیا ہمارے باپ دادا ایک ہی جگہ نہیں رہتے تھے؟ کیا وہ شکار پر اکٹھے نہیں جاتے تھے؟ تو آج کیسے سرکارِ قبلہ کا فرمان سنا جائے کہ زگریوں کی دزکُش (ذبح کیے جانے والے جانور) کھانے سے ایمان خطرے میں پڑے گا؟ اگر ایمان اتنا نازک ہے تو بے ایمانی صحیح"۔ اب گوتم کا لہجہ سخت ہو گیا تھا اور وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔

طلعت نے پھر گوتم سے سوال کیا: "گوتم آپ کا مطلب ہے کہ ہمیں محافظ کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ ہر چیز کے پیچھے انھی کا ہاتھ ہے؟"

گوتم ہنسنے لگا: "طلعت صاحبہ! کچھ باتوں کو سمجھنے کے لیے تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے جب کہ کچھ باتیں ادب بتاتا ہے۔ بدقسمتی سے یہاں ادب اور تاریخ کی کتابیں زمین بوس ہیں۔ پچھلے مہینے میں نے اپنی تمام کتابیں

بوری میں ڈالیں اور ایک گڑھا کھود کر اس کے اندر رکھ دیں۔ مٹی شاید میری کتابوں کی حفاظت نہ کر سکے لیکن گھر میں یہ کتابیں مجھے لاپتہ کروا سکتی ہیں۔ کتابیں مجھے بچوں کی طرح عزیز ہیں اور میں اپنے بچوں کو جلتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہمیں معلوم ہے یہ کون کروا رہا ہے لیکن ہم میں شعور نہیں ہے۔ اگر شعور ہوتا تو ہم نام لینے سے نہیں کتراتے۔ جو قوّتیں یہ سب کچھ کروا رہی ہیں وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ زگر آباد کے وسائل لوٹنے کے لیے ہمیں یہاں کے طاقت وروں کو خوش رکھنا ہو گا۔ اسی لیے یہاں سیاسی، مذہبی اور قبائلی طاقت وروں کے لیے زگر آباد کو لکیر اور وقت کے درمیان تقسیم کیا گیا ہے۔ لکیروں سے حدود قائم ہیں اور وقت سے وہ لمحات جس میں طاقت کو قانون کے دائرے سے نکال کر سرداروں کی مونچھوں اور جماعتیوں کی داڑھیوں میں رکھا گیا ہے۔"

چمپا نے ناراضی کا اظہار کیا اور کہنے لگی: "گوتم تمہارا دماغ خراب ہو چکا ہے جاؤ اس کا علاج کراؤ، یہ نہ ہو سرکارِ قبلہ کو علاج کرنا پڑے۔ تم ایک ادبی شخص ہو لیکن تمھارے اندر شعور نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔"

گوتم نے کچھ نہیں کہا لیکن جب کمال نے بولا کہ ہم سرکارِ قبلہ سے دوری اختیار نہ کریں اور ان کی ہاں میں ہاں ملا لیں تبھی ترقی کر سکتے ہیں تو گوتم نے پھر خاموشی توڑی اور کہا: "موت کا خوف بھی عجیب ہے جو شعور یافتہ لوگوں کے دماغ پر بھی اپنا قبضہ جماتا ہے اور انھیں متواتر غلط کو صحیح ثابت کرنے پر اکساتا ہے۔" کسی زمانے میں گوتم نے خوف کا فلسفہ پڑھا تھا اسی لیے اس کے ذہن میں آیا کہ خوف کے موضوع پر بات کرے مگر طلعت نے فوراً یہ سوال پوچھا:

"گوتم صاحب! آپ کا کیا خیال ہے جو آپ کی باتوں سے اتفاق نہ کرے وہ خوف زدہ ہے؟ کیا نظریاتی اختلافات نہیں ہو سکتے؟"

گوتم نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا جواب دیا: "نظریہ، مزاحمت، خوف اور سیاست ان تمام چیزوں میں فرق کرنا ضروری ہے۔ مزاحمت برسوں سے ہماری تہذیب کا حصّہ رہی ہے۔ لوگوں نے بلا خوف مزاحمت کے

لیے قربانیاں دی ہیں۔ نظریہ کسی خاص مقصد کے تحت ہوتا ہے اور اسی کے حصول کے لیے تگ و دو کی جاتی ہے۔ کیا یہ نظریاتی اختلاف ہے کہ بیرونی قوتوں کو گھر کے اندر لے آؤ اور انہیں اپنی غیرت بیچ دو یا پھر نظریاتی اختلاف یہ ہے کہ برسوں کی روایات اور ثقافت کو پسِ پشت ڈال کر اپنے بھائیوں کا قتلِ عام کرو جس طرح جماعتیوں نے پچھلے کچھ سالوں میں کیا ہے۔ اگر آپ لوگ ان چیزوں کو جرم نہیں سمجھتے تو پھر بحث بے کار ہے۔"

بحث چلتی رہی اور کسی بھی نتیجے کے بغیر ختم ہو گئی۔ طلعت، شنکر اور چمپا اب کمال کے شاگرد ہو گئے اور کمال اُن کو سرکاری ادب پڑھاتا رہا۔ اس دن کے بعد گوتم کمال کے یہاں دوبارہ نہیں آیا۔ اب اس نے لوگوں سے ملنا جلنا ختم کیا اور ہفتوں بعد نظر آنے لگا۔ گھر کی چار دیواری میں بیٹھ کر اس نے موسیقی سیکھ لی تھی۔ جب سے انھوں نے سرکار کے ڈر سے کتابیں زمین بوس کی تھیں تب سے وہ موسیقی کا سہارا لے رہا تھا۔ لیکن سازوں میں وہ سُر نہیں تھے جو کتابوں کے صفحوں کو پلٹنے سے اس نے محسوس کیے تھے۔ اس نے ایک دن اپنا بینجو صحن کے کسی درخت کے اوپر باندھ دیا تاکہ اجنبی سپاہی اسے ضبط نہ کریں۔ کیوں کہ انہیں یہ شک ہونے لگا تھا کہ انقلابی ضرور کچھ نئے ساز ایجاد کریں گے جس سے وہ نوجوانوں کو اپنی طرف راغب کریں گے۔ اسی لیے جماعتیوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ مذہب ہمیں ساز بجانے کی اجازت نہیں دیتا، اس لیے آج کے بعد کوئی ساز نہیں بجائے گا۔ لیکن لوگوں نے ان کی باتوں کو زیادہ سنجیدہ نہیں لیا تو یہ فیصلہ ہوا کہ پُرانے ساز اور دھنوں کی اجازت دی جائے۔

اگلے دن گوتم نے گھر سے اپنے دادا کی بندوق نکالی جو ایک زمانے میں اس نے بکریوں کی حفاظت کے لیے لی تھی اور اس سے کئی بھیڑیے مار چکا تھا۔ گوتم نے اسے قمیص کے نیچے رکھا اور گھر سے نکل پڑا۔ آہستہ آہستہ وہ بازار سے پہاڑوں کی طرف جانے لگا۔ کچھ ہی دیر میں وہ بہت دُور نکل گیا اور آخر کار وہ پہاڑوں میں پہنچ گیا جو کھڑے اس کی راہ تکتے تھے۔ پہاڑ اسے پہلے سے جانتے تھے اسی لیے تعارف کی ضرورت نہیں پڑی۔ کچھ عرصہ گُزرنے کے بعد وہ مشہور کمانڈر بنا اور ہر جنگ کا حصّہ بنا۔ اب زگر آباد کا استاد، شاعر اور ادبی شخصیت جو امن کا درس دیتا تھا اور ادب پر بحث کرتا تھا ایک کٹّر انقلابی بنا اور اس کے بعد ایک جنگجو۔ لوگوں کو یقین نہیں آیا

کہ ایک ادبی شخص کیسے شدّت پسندی اختیار کر سکتا ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ ادیب شخصیت تھا ہی نہیں محض ایک جذباتی اور انقلابی تھا۔ مگر کسی نے یہ نہیں سوچا کہ کن قوّتوں کی وجہ سے وہ بندوق اٹھا کر پہاڑوں تک پہنچ گیا ہے۔ گوتم کے بعد اس کے کئی شاگرد اس کی پیروی کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ کمال اب ایک سرکاری استاد کی حیثیت سے سرکارِ قبلہ کا تعلیمی نظام سنبھال رہا تھا۔ چمپا کے والد ایک پارلیمانی سیاستدان تھے اور اب وہ زگر آباد کے صدر تھے جب کہ طلعت ایک نام ور بیوروکریٹ۔ شنکر نے خود کو ان چیزوں سے دور کیا اور ایک سادہ زندگی گُزارنے لگا۔

گوتم اڑتالیس سال کا ہو چکا تھا اور اس کی نگرانی میں کئی نوجوان کمانڈر اس جنگ کا حصّہ بن گئے تھے۔ زگر آباد کی ایک نسل سرکاری اور دوسری نسل انقلابی بن چکی تھی۔ کون صحیح اور کون غلط اس کا فیصلہ خاصا مشکل تھا۔ کبھی یہاں لاشیں گرتیں، کبھی وہاں لوگوں پر گولیاں چلنے لگیں۔ زگر آباد کو آزاد کرنے کے منصوبے بنائے گئے۔ نہ بچے محفوظ رہے نہ جوان نہ ہی عورتیں۔ دونوں طرف سے لوگ مرنے لگے۔ اُن کے درمیان ایک اور گروہ جماعتی تھے جو زگر آباد کی سرکار کی مدد سے اب بھی اپنی تحریک چلا رہے تھے۔

ایک دن خبر پھیل گئی کہ گوتم جنگ میں زخمی ہو گیا ہے مگر وہ زندہ ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں زخمی ہیں اور اب نہ وہ بندوق پکڑ سکتا ہے اور نہ ہی کتابوں کے صفحے پلٹ سکتا ہے۔ ساز ایجاد کرنے کے لیے اس کی انگلیوں کی دُھن ختم ہو گئی ہے۔ اس کی جگہ نیا کمانڈر آیا ہے اور اب وہ جنگوں کا حصّہ بھی نہیں رہا۔ نہ ہی جنگی منصوبہ بندیوں میں شامل ہے۔ اسے اپنی حالت پر بہت دُکھ ہوا اور اچانک ایک دن اس نے یہ تہیہ کر لیا کہ وہ سرکاری دفتر پر بلاسٹ کرے گا۔ اس نے خود کش جیکٹ پہنی اور خود کو دھماکے سے اڑا دیا جس سے کئی بے گناہ افراد مارے گئے اور کئی لوگوں کو نقصان پہنچا۔ گوتم کا جسم کئی ٹکڑوں میں بَٹ گیا۔ لیکن اس کا بایاں ہاتھ انگلیوں سمیت ایسے پڑا تھا جیسے وہ زمین کو کھودنا چاہتا ہے اور اپنی کتابیں نکال کر ان میں لکھے گئے تمام حروف کو مٹانا چاہتا ہے جو جنگ کی حمایت میں لکھے گئے تھے۔

دعا زہرا

گنگا کے کنارے، غازی کا عَلَم ہوتا*

پچھلی گاڑی کے چیختے ہارن پر گوتم نے رکشے سے منہ نکال کر باہر جھانکا۔ نہر پر ٹریفک کے اژدہام میں کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ بسوں، گاڑیوں اور رکشوں کے دھوئیں نے ہوا کو زہریلا بنا دیا تھا۔ آسمان پر بادل ادھر سے ادھر تیرتے پھر رہے تھے اور نہر کے گدلے پانی میں معصوم بچے اپنے ارد گرد سے بے خبر بادلوں کے عکس کا تعاقب کر رہے تھے۔ گوتم چہرے پر مسکراہٹ لیے، مبہوت ان بچوں کو دیکھنے لگا۔

''زندگی کا پہیہ کس قدر تیزی سے گھومتا ہے؟'' اس نے سوچا۔

کل وہ اپنی ماں کو جھانسا دے کر، گزرتے لوگوں کی حقارت بھری نظروں سے لاتعلق ہو کر، اسی نہر کے پانی میں گھلے بادلوں کے عکس میں اپنے خوابوں کو تراش رہا تھا، اور آج وہ اُن خوابوں کے سحر سے دور، خود ایک راہ گیر بنا کھڑا تھا۔ اگر اسے اپنے وجود کا یقین نہ ہوتا تو وہ اپنے بچپن کے دنوں کو اپنا پہلا جنم تصور کر بیٹھتا۔ اسے اس خیال میں چمپا کی آواز سنای دی۔ اس احساس پر گوتم یک دم بے ساختہ ہنسا۔ رکشے والے کی طنزیہ نظر سے بے خبر، وہ بہت دیر یوں ہی ہنستا رہا، یہاں تک کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔ گوتم اپنے ذہن کی معصومیت پر رشک کر رہا تھا۔ کس آسانی سے اس نے اس بے آواز کو بھی آواز دے ڈالی۔ چمپا کی تو آواز ہی نہیں تھی، پچھلے چار سالوں میں اس نے فلسفیوں کی آواز میں اس سے باتیں کی تھیں۔ وہ اس سے بات کر بھی رہی

* ہم نے ڈاکٹر ناصر عباس نیّر سے قرۃ العین حیدر کے ناول آگ کا دریا کے عنوان سے کورس پڑھا۔ ٹرم پیپر کے طور پر ہم سے کہا گیا کہ ہم آگ کے دریا کی کہانی کو آگے بڑھائیں، یعنی جہاں آگ کا دریا ختم ہوتا ہے اس کے بعد کی کہانی ناول کے کرداروں کے ذریعے لکھیں۔ میں نے یہ کہانی لکھی۔

تھی، یا وہ کان لگائے سُن رہا تھا، اسے معلوم نہ تھا۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کیا چمپا اس کا بتایا ہوا نام تھا، یا یہ بھی اس کے ذہن کی اختراع تھی۔ ان خیالوں میں اگر کوئی شے حتمی تھی، تو وہ سمسارا و کرم کا فلسفہ تھا جو یا اُس نے سنایا تھا یا اِس نے سنا تھا۔

ہندو مت کے اس فلسفہ کے مطابق، انسانی جسم فانی ہے مگر آتما کو ازلی بقا حاصل ہے۔ جسم گردشِ لیل و نہار سے ختم ہو جاتے ہیں پر روح کا دائمی سفر قائم رہتا ہے۔ وہ ایک وجود سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے میں، مکتی کی امید لیے بھٹکتی ہے۔ ایک جنمی وجود کا دوسرے سے ظاہری طور پر کوئی تعلق نہیں ہوتا، مگر کرم کے فلسفے کے ذریعے، بغیر جانے انسان ہر زندگی میں پرانے اعمال کا خمیازہ بھگتتا ہے۔

گوتم نے اکثر اس فلسفے پر غور کیا تھا اور وہ سوچتا تھا کہ کیا انسان کی زندگی کئی جنموں پر مبنی نہیں؟ شیر خواری کی عمر، بچپنا، بلوغت، جوانی، ادھیڑ عمری، اور بڑھاپا، کیا یہ مختلف جنموں کی مانند نہیں تھے؟ ایک جوان اپنے کم سن وجود کے ذہنی و جسمانی تجربوں سے اجنبیت محسوس کرتا ہے، وہ تصویروں میں خود کو نہیں، ایک اور وجود کو دیکھتا ہے۔ بچپن کی کوتاہیوں کو جوانی میں بھگتتا ہے، کرم کے فلسفے کی مانند۔ کیا میرا وجودی بحران میرے بچپن کے ادھورے خوابوں کا صلہ نہیں؟ پھر کیا میں اپنے ماضی کا گریبان پکڑوں یا اپنے کا ہل حال کا؟ کیا مجرم پھر نفسانی خواہش نہیں اور موکشا اس سے آزادی؟

گوتم نے اپنے خیالوں کی رو پر سَر ہلاتے ہوئے سوچا، اگر چمپا یہ خیال سن لیتی تو شاید ان خیالوں کو میرے نام سے نسبت دے کر مجھے pseudo-philosopher ہونے کا طعنہ دیتی۔ مگر یہ خیال بھی مجھے میرے ذہن کی تصوّری ایجاد محسوس ہوتا ہے کیوں کہ معمّہ ہی یہ ہے کہ چمپا خیالوں کی قائل نہیں۔

رکشے والے کے اونچے ہارن نے گوتم کو اس کی خیالی دنیا سے یک دم بے دخل کر دیا تھا۔ وہ ابھی بھی نہر کنارے، شور مچاتی، ہارن بجاتی گاڑیوں کے جمِ غفیر میں اپنے رکشے میں پھنسا پڑا تھا۔ لاہور کی ہٹ دھرم ٹریفک سے بخوبی واقف تھا اس لیے اس نے باقی کا رستہ پیدل طے کرنے کا سوچا۔ رکشے والے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس نے اپنے سفر کا معاوضہ دیا اور فائل تھامے رکشے سے کود پڑا۔ اب آسمان پر غصیلے دیوتا اپنی طاقت کا مظاہرہ

کرتے ہوئے گرج رہے تھے اور زمین پر مجازی خدا اپنی حماقت کے خلیفہ بنے، ایک دوسرے پر برس رہے تھے۔ ان کے درمیان، گوتم حسینی، اپنے خیالوں کے ہمراہ، مال روڈ کی طرف گامزن تھا۔

وہ اپنی فطرتی عادت سے مجبور اپنے تخیل کی دنیا میں زمانے سے بے خبر، بادلوں کے سائے میں چلا جارہا تھا۔ پچیس سال کی عمر میں، اس کے ذہن کی تخلیق کردہ دنیا حقیقت کی تاب نہ لاتے ہوئے آہستہ آہستہ کھنڈرات میں تبدیل ہوتی محسوس ہورہی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر مڑ کر ان بچوں کی طرف دیکھا جو اب نہر میں ڈُبکیاں لگاتے، بادلوں کے عکس کو بگاڑتے نظر آرہے تھے۔ انسان کی زندگی بھی ان بادلوں کی مانند تھی، اس نے چلتے ہوئے سوچا۔ ان بادلوں میں ذوقِ نظر کو بے جان و جان دار سے بھری ایک دنیا بسی دکھائی دیتی ہے، مگر حقیقت یہی ہے کہ وہ بادل چاہے جو بھی روپ دھارے، اپنی فطرت و صورت حال کا پابند رہتا ہے، اور آخر کو صرف برسنے کی طاقت رکھتا ہے۔ امکانات کا فریب گوتم کا بھی مجرم تھا۔ اس عمر میں گوتم نے خود کو لاہور کے Bill Boards پر لگا دیکھنا تھا۔، ہر سال اجوکا کے ایک تھیٹر ڈرامے کا حصّہ بننا تھا، ایک سٹریٹ تھیٹر گروپ تشکیل دینا تھا۔ مگر اس کے بجائے وہ اپنا سی وی تھامے، ایم بی اے کی ڈگری کا پٹا پہنے، لاہور کے کونے کونے میں نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا تھا۔ اس روز بھی وہ شہر کے مختلف بینکوں میں اپنا سی وی جمع کراتا پھر رہا تھا۔

مال روڈ کی سفید، نوآبادیاتی عمارتیں دیکھتے ہوئے، گوتم نے اپنی جیب سے فون نکالا اور میسج میں لکھے پتے کو سمجھتے ہی اپنے قدموں کی رفتار بڑھادی۔ وہ اپنے والد کے اصرار پر ان کے ایک دوست کو اپنا سی وی دینے آیا تھا۔ نقوی صاحب، ایک ادھیڑ عمر آدمی تھے جن سے سالانہ دسویں کے جلوس میں ملاقات ہوتی تھی۔ کالی شلوار قمیص زیبِ تن کیے، آستین الٹائے، دامن چاک کیے، بالوں میں خاک اُڑائے، کڑیاں پہنے، ذوالجناح کی لگام تھامے نقوی صاحب، اس پہر آرمانی کا سوٹ پہنے، ٹائی لگائے، ایک عالی شان دفتر میں گوتم کے برعکس بیٹھے اس کا سی وی دیکھ رہے تھے۔ کچھ منٹوں کی خاموشی کے بعد، انھوں نے عینک میز پر رکھی، اور ہر رعب دار افسر کی طرح، دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست کرکے، گھمبیر آواز میں بولے:

اپنا سی وی یہیں چھوڑ جاؤ، میں تمہیں کل تک بتاؤں گا، کچھ ہو سکتا ہے کہ نہیں۔

چائے کی ایک پیالی اور چند روایتی جملوں کے تبادلے کے بعد گوتم نے ان سے رخصت لی۔ ان کے دفتر سے نکلتے ہوئے، حسبِ عادت، اُس نے عمارت کا طائرانہ جائزہ لیا۔ شاہ دین منزل-۱۹۱۴ء۔ یعنی نو آبادیاتی دور کی تعمیر کردہ عمارت تھی، جو ایک صدی سے اس خطے کی تاریخ کی ستم ظریف، خاموش گواہ بنی کھڑی تھی۔ پنجاب کی عدالتِ عظمیٰ کے پہلے مسلمان قاضی کے نام پر بنائی گئی یہ عمارت، اس سڑک پر ان چند عمارتوں میں شمار ہوتی تھی جو مسلمانوں نے تعمیر کیں اور انھی کی ملکیت رہیں۔ مگر مقامِ تاسّف یہ ہے کہ اس کی تعمیر کا انداز اور تاریخ میں استعمال، نو آبادیاتی ذہنی غلامی کی یاد دلاتا تھا۔

گوتم عمارت سے نکلا اور نقوی صاحب کی دی ہوئی چھتری کے سائے میں قریبی بس سٹاپ کی طرف، محتاط قدموں سے چلنے لگا۔ ہلکی بارش نے زمین پر پھسلن پیدا کر دی تھی، جس کی وجہ سے بس چند لمحوں کی تاخیر کا شکار تھی۔ معلوم نہیں کہ یہ برسات کا اثر تھا یا وہ گھر جانے سے کترا رہا تھا، مگر گوتم کو یہ تاخیر ناگوار نہیں گُزر رہی تھی۔ ایک مبہوت مسکراہٹ پھر اس کے لبوں پر طاری تھی۔ وہ اپنے گرد اُن عمارتوں کو حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے انھیں "ذہنی غلامی کی علامتیں" قرار دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ عمارتیں کتنی مایوس کن محسوس ہوتی ہیں، جیسے یہ کسی کی ناکام نقل اتار رہی ہوں۔ اس نے مڑ کر پھر ایک مرتبہ شاہ دین منزل کو دیکھا، مگر اس دفعہ اسے ایک درمیانے قد کا ہندوستانی مرد، اپنے ناپ سے بڑا سوٹ پہنے دِکھائی دیا، جس کا نام اس نے "ابن الوقت" فرض کیا۔

ایک اونچے سے ہارن کی آواز ایک مرتبہ پھر گوتم کو زمانۂ حال میں گھسیٹتی لے آئی۔ گوتم نے چھتری کو جھاڑتے ہوے بند کیا اور بس کارڈ نکال کر تیزی سے انتظار کرتی لال بس پر سوار ہو گیا۔ لاہور کے برساتی موسم سے اِس بس کا اندرونی حصّہ بھی محفوظ نہ تھا، گوتم نے کیچڑ زدہ فرش پر چلتے ہوئے، ایک خالی نشست پر بیٹھنے کے بعد سوچا۔ بس چلنے لگی اور عمارتیں اِس تیزی سے گُزرنے لگیں کہ ان کے نہ ہونے کا گمان ہونے لگا۔ گوتم لاہور کو ظالم تصوّر کرتا تھا اور مال روڈ کو اس کی سفاکی کا مظہر مانتا تھا۔ تاریخ میں لاہور کئی راج دھانیوں کی جاگیر رہا تھا، مگر چندر گپت موریہ کا لاہور، ملک ایاز کا لاہور، اور رنجیت سنگھ کا لاہور، یہ سب اب کھنڈرات میں تبدیل ہو چکے

تھے، اگر کوئی لاہور کا تاریخی باب واقعی محفوظ تھا تو وہ انگریزوں کا لاہور، بہ صورتِ مال روڈ تھا۔ مغلوں کے لاہور کو تو بھارت کے وجود کے خلاف کسی ضد میں حیات بخشی گئی تھی۔ اس سیاسی حیات میں گِنے چُنے آثارِ قدیمہ کو تحفظ فراہم کیا گیا تھا اور وہ بھی اس شرط پر کہ ان سے متعلقہ تاریخ کو قوم پرستی کے قلم سے قوم کے ذہنوں پر کندہ کیا جائے گا۔ نو آبادیات سے دست برداری صرف ایک نظریہ تھا جو چند نجی سکولوں سے پڑھے، تارکینِ وطن اور مغربی ملکوں میں آسائش سے رہنے والے ملک بدر پاکستانیوں کی وراثت تھی۔ باقی تو منّظم انداز میں تیار شدہ ذہنی غلام تھے۔

بس جین مندر والے سٹاپ پر رُکی۔ گوتم نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی جس پر شام کے ۴ بج رہے تھے۔ اس نے اپنی چھتری اُٹھائی اور ایک قریبی چائے خانے کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ وہ ایک زرد سفید رنگ کی عمارت کے سامنے آکر ٹھہر گیا۔ کھڑی موٹر سائیکلوں کے درمیان سے رستہ بناتے ہوئے، وہ عمارت میں داخل ہوا۔ پاک ٹی ہاؤس، لاہور کے ادبی و تہذیبی ورثے کی علامت تھا۔ بیسویں صدی میں، شہر کے اشتراکی و ترقی پسند شعرا اور ادیب یہیں ملتے تھے اور تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ مگر اب جس عمارت میں گوتم موجود تھا، وہاں سے مفکرین کا گزر نہ تھا۔ اب یہاں چند طالب علم قیمتوں کی رعایت کے لالچ میں آتے تھے یا چند ضعیف العمر، گوتم کی طرح اُن گزرے شعرا اور مصنّفین کی تصوّراتی جھلک کی تلاش میں گھنٹوں یہاں بیٹھے رہتے تھے۔

گوتم کھڑکی کے نزدیک موجود میز پر اپنی چائے کی پیالی کی تاک میں بیٹھ گیا تھا۔ بارش تھم چکی تھی اور سورج کی مدھم کرنوں نے آسمان پر دھنک کے رنگ بکھیر رکھے تھے۔ اُس نے جیب سے فون نکال کر آسمان کی تصویریں کھینچنا شروع کر دیں۔ پھر ایک فنون کے نقاد کی مانند، اُن تصویروں کو اُس نے جمالیاتی تناسب کی نظر سے تولا اور ایک سے اس قدر مطمئن ہوا کہ اسے اپنے تیس Followers والے انسٹاگرام کے اکاؤنٹ پر لگا ڈالا، جہاں شاید ایک، دو Likes مجبوریِ مراسم کے تحت اس کو نصیب ہو جائیں۔ ایک چائے کی پیالی میز پر رکھی تھی مگر گوتم کی توجہ کا مرکز اس کے قریب سے آنے والی آواز بن گئی۔

”گوتم سر، کیسے ہیں آپ؟ کافی عرصے کے بعد آپ نظر آئے ہیں۔“

گوتم نے ذرا سا گھبرا کر اس مانوس لہجے کے پیچھے موجود اجنبی آدمی کو پہچاننے کی کوشش کی۔ اسے اپنی اعلیٰ یادداشت کا غرور تھا، مگر وہ اس آدمی کو پہچان نہیں پا رہا تھا۔

''سوری، آ- آپ کون ہیں؟ میں نے آپ کو پہچانا نہیں؟'' اس نے ہڑبڑاتے ہوئے کہا۔ اسے اپنی بڑھتی ہوئی گھبراہٹ کی وجہ نہیں سمجھ آ رہی تھی۔ اس نے اس شخص کی اجنبیت کو اس کی وجہ فرض کیا۔

''میں نے تو معصومانہ سے انداز میں آپ سے آپ کی خیریت طلب کی تھی، آپ نے تو ایک وجودی بحران برپا کر دیا۔ جہاں تک پہچاننے کا سوال ہے، تو اس کی شرط تعارف ہے جو میں نے ابھی کرایا نہیں اور کون ہونے کا جواب میں دینے سے قاصر ہوں کیوں کہ اس کی شرط ''ہونے'' کو تسلیم کرنا ہے، اور میں اس کا انکاری ہوں۔'' اس نے ایک لطف اندوز مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور ساتھ والے میز سے برتن اکھٹے کرنے میں مصروف ہو گیا۔

گوتم نے چڑ کر اپنی پیالی کو اپنے نزدیک کیا۔ وہ ایسے کئی لوگوں کو جانتا تھا، جو باتوں کو گھما کر، لفظوں کو نچا کر عام باتوں کو جعلی فلسفیانہ رنگ دیتے تھے۔ اسے ایسے لوگوں سے خوف بھی آتا تھا، کیوں کہ اسے کبھی کبھار ان میں اپنا آپ نظر آتا تھا۔ ایک ایسا آدمی نظر آتا تھا، جو اپنے معاشی حالات سے مجبور ایک سائے کی طرح، بے کار انداز میں، زندگی کی موجوں کے زور پر اندھا دھند چلے جا رہا ہو، اور ان جعلی فلسفیانہ باتوں کے ذریعے اپنے لیے ایک فراری تصوّراتی دنیا تخلیق کر چکا ہو جس میں وہ اپنی بے مقصد زندگی کو مقصد عطا کرتا ہو۔

شاید یہ عمارت کی ویرانی کا اثر تھا یا پھر گوتم کی اشتعال انگیز فطرت کا دوش۔ گوتم نے اس اجنبی کو مخاطب کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا:

''پھر تو آپ ناموں کے بھی قائل نہیں ہوں گے؟ بندۂ خدا کہلواتے ہیں یا بندۂ زمانہ؟''

''دن میں زیادہ تر لوگ مجھے 'ایک کپ چائے' سے مخاطب کرتے ہیں اور میں 'ہری' سے زیادہ اس نعرے پر متوجہ ہوتا ہوں۔ اقبال، شاید ہم ہائی سکول ڈرام آؤٹس کو ان خیالی جدّتوں میں یاد رکھنا بھول گئے۔'' ہری نے ہنستے ہوئے گوتم کے برعکس رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

گوتم نے ایک ابرو اٹھا کر اس نیم خالی کمرے میں نظریں گھمائیں۔ وہ ہری کو اس عمارت کی تنہائی سے آشنا کرتے ہوے بولا: ''آپ کو خالی عمارتوں سے بھی آوازیں آتی ہیں؟ یا اب کیا آپ تنہائی کو بھی ایک انسانی آواز بخشیں گے؟''

ہری، نے اپنی ٹوپی اتاری اور مسکراتے ہوئے اپنے گھنگریالے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا: ''کیوں نہیں! تنہائی سراپا انسان ہے اور انسان سراپا تنہائی۔ یہ وہ اکلوتا احساس ہے جس سے انسان جنت میں بھی فرضی آزادی نہیں پا سکتا۔ آدم، بشر اول، تخلیق کی معراج پر پیدا کیے گئے تھے۔ وہ تنہا خدا کی توجہ کا مرکز تھے، وہی وجودی انفرادیت ایک ایسی تنہائی کا باعث بنی جس سے نجات صرف ایک اور انسان کے وجود کے ساتھ ممکن تھی۔''

''کافی یونگیّن خیال کا اظہار کیا ہے آپ نے کارل ژونگ ایک سوِس ماہرِ نفسیات تھے جنھوں نے تنہائی کو انسانوں کی وجودی قربت سے نہیں بلکہ خیالوں کو آزادیِ اظہار سے سمجھا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ انسان تب خود کو تنہا محسوس کرتا ہے جب وہ کسی دوسرے کو اپنی تجرباتی حقیقت میں دو وجوہات سے شامل نہیں کر پاتا، پہلی وجہ ایک وجودی فرق، جو بشر اوّل اور اس کے خدا کا تھا، اور دوسری وجہ خیالاتی غیر مقبولیت ہے، یعنی ایسے خیال کا حامل ہونا جو عام شعور کی رو سے مختلف ہو۔''

''گوتم، تم اپنی تنہائی سے اس قدر گھبراتے کیوں ہو۔ کیوں لاشعوری خیالوں سے مغلوب ہو کر اس ابدی احساس کے انکاری بنے بیٹھے ہو۔ کیوں اپنے وجود سے خوف زدہ ہو کر فلسفیوں کی آوازوں میں گفتگو کرتے ہو؟'' ہری نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔ مگر اس سے پہلے کہ گوتم اس جرأت پر اس کا گریبان پکڑتا یا اس سے اس خیال کی وضاحت طلب کرتا، چائے خانے کا دروازہ کھلا اور چند گاہک شور مچاتے عمارت میں داخل ہو گئے۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے، ''تین کپ چائے'' کا نعرہ بلند ہوا اور حسبِ عادت ہری فوراً ان کی امداد کو پہنچا۔ گوتم نے زور سے چائے کا کپ میز پر رکھا اور عمارت کا دروازہ پٹختے باہر سڑک پر نکل آیا۔

وہ غصّے کا تیز تھا، اس انسانی جذبے کو اپنی کمزوری مانتا تھا۔ بچپن میں اکثر وہ کسی نہ کسی لڑائی میں خود کو

ملوّث پاتا۔ اس کی اس عادت سے پریشان، اس کی دادی نے اسے لاشعوری طور پر ڈرامے کے فن سے متعارف کرایا۔ اس کی دادی اسے کہتی تھیں:

"بیٹا، جب تم کسی پر غصّہ ہو، اور تم اس کا اظہار کرنا چاہو، تو فقط ایک لمحے کے لیے خود کو اُس کی جگہ پر رکھو، اس کے جارحانہ عمل کی وجہ سمجھو، اور اگر تمھیں لگے کہ یہ فقط اپنے حالات کی پیداوار ہے، تو آنکھیں بند کر کے تین تک گننا اور مڑ کر سیدھا گھر آجانا۔"

اُس روز کے بعد سے، گوتم نے Shakespeare کا انجانا جانشین بن کر، دنیا کو ایک طویل ڈرامے کا اسٹیج تصوّر کیا جس پر اس نے اپنی تخیل کی طاقت سے عام انسانوں کو کرداروں میں تبدیل کر دیا تھا اور خود اس کی آواز، آوازِ مصنّف بن بیٹھی تھی۔ یہ فراری تصّور (Escapist Fantasy) کب ایک جنون میں بدل گیا اس کو معلوم نہ تھا، مگر نو عمری میں ہی آدم کی طرح اسے بھی کوئی اس دنیائے تخیل کا گواہ چاہیے تھا۔ اس کا لاشعور اب مناسب سامع نہیں تھا۔ مگر معاشی حالات نے اُس سے اِس فن کی قربانی طلب کی اور جس عمر میں وہ غصے جیسے مضر جذبے کو دفنانے کی اُمید رکھتا تھا، اس عمر میں اس نے اس معصوم خواب کا جنازہ پڑھا تھا۔

گوتم نے آنکھیں بند کیں، تین تک گنا، اور اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ آسمان پر مبہم سا چاند، سورج کی غروب ہوتی روشنی کے خلاف لڑتا نظر آرہا تھا۔ چند منٹوں کی مسافت کے بعد عمارتیں خستہ ہونے لگیں۔ سیاسی و مذہبی اشتہار اس اعدادی شدّت سے دیواروں، دروازوں اور کھمبوں پر لٹکائے گئے تھے کہ ان کو سمجھنا ناممکن تھا۔ گوتم نے سوچا کہ شاید مقصد سمجھانا اور قائل کرنا ہے ہی نہیں، بلکہ خوف کی شدّت سے، گھبراہٹ کے عالم میں اندھی تقلید پر قائم رہنا ہے۔ شام کے پانچ بج رہے تھے، اور انسانوں کا ایک ہجوم بھاٹی گیٹ کے گرد و نواح میں موجود تھا۔ مغل بادشاہ اکبر کا بنایا ہوا یہ دروازہ لاہور کو حملوں سے محفوظ رکھنے کی نیت سے تعمیر کیا گیا تھا، مگر اب یہ صرف ایک تاریخی ورثہ تھا، جس پر آتے جاتے لوگ اشتہار چپکاتے، کوڑا پھینکتے اور مبہم خیالات سے اس کے اندر کی دیواروں کو آویزاں کرتے۔ گوتم اِس دروازے سے ہوتا اپنے محلے میں داخل ہوا، جہاں کالے کپڑے ہر در و دیوار سے لٹک رہے تھے۔ محرم کے پہلے دس دنوں میں، محلے کی دیواروں پر لکھے شیعہ کافر کے

نعرے عزاداروں کی نظروں سے اوجھل کر دیے جاتے ہیں۔ گوتم نے اس نظارے کو ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔ اس کے نزدیک ہماری قوم کا سب سے بڑا مسئلہ ہی یہی تھا کہ ہم غلط کی درستی نہیں کرتے، خواہ وہ ۱۹۷۱ء کا ماجرا ہو یا اقلیتوں کی نسل کشی، اس بات کو دبا کر اس کے نہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور جب مسئلہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو چند پشیمانی کے لفظوں سے یہ قوم معصوموں کے خون کا کفارہ ادا کرتی ہے۔

گوتم ایک عَلَم والے گھر کے باہر آ کر رک گیا۔ دروازے کے ساتھ دیوار پر باہر انگریزی میں 'دت ہاؤس' لکھا ہوا تھا۔ ستم ظریفی کی بات یہ تھی کہ اس گھر میں رہنے والا کوئی شخص اس نام سے پُکارا نہیں جاتا تھا، یہ تقسیمِ ہند کی نعمت تھی جو اس کے دادا کے حصّے میں آئی تھی۔ اس ملک کے بیشتر باشندوں کی مانند وہ بھی کسی اور کی شناخت کے سائے میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ گوتم نے دروازہ کھولا اور ایک گہری سانس بھر کر گھر کے آنگن میں داخل ہوا۔ تقسیمِ ہند سے پہلے کا تعمیر کردہ یہ گھر پانچ کمروں پر مشتمل تھا، جو سارے ایک چھوٹے سے آنگن میں کھلتے تھے۔ گوتم کا بچپن انہی دیواروں کے درمیان گُزرا تھا اور اب اسے خوف تھا کہ اس کا دم بھی یہیں نکلے گا۔ دروازے کو بند کر کے گوتم دائیں جانب پر موجود، اوپری منزل کو جانے والی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس کی اپنے والد سے ویسے ہی دن میں ایک مرتبہ، ناشتے کی میز پر ملاقات ہوتی تھی مگر محرم کے دنوں میں تو اس کے باپ کے ہونے کا ثبوت صرف باورچی خانے میں موجود رات دیر کو رکھے گندے برتن تھے۔ پُورے دن کی مشقت کے بعد، گوتم نے اس رات جلدی سونے کا فیصلہ کیا۔

اس نے خود کو حالتِ خواب میں واپس اس چائے خانے میں پایا، وہ اس کے لاشعوری تخیل کی دنیا میں بھی ویران تھا۔ گوتم عمارت کے درمیان میں موجود میز پر بیٹھتا ہے اور اس پر موجود خالی کاغذ پر غور کرتا ہے۔ جب وہ سر اٹھا کر ارد گرد نظر دوڑاتا ہے تو اسے فیض سے لے کر منٹو تک تمام شعرا اور ادیب اس کے گرد حلقہ بنائے نظر آتے ہیں۔ وہ یک دم اس سے مخاطب ہوتے ہیں مگر ہم آواز ہو کر نہیں۔ وہ ان کی باتیں سمجھ نہیں پاتا۔ وہ دیکھتا ہے کہ وہ سب آہستہ آہستہ ایک وجود میں ڈھل رہے ہیں۔ گھنگریالے بال، مانوس آنکھیں اور دوستانہ نگاہیں، ہر ی ان کے وجودوں کی شکستہ تصویر بنے، میرے سامنے موجود تھا۔

فجر کی اذان سنائی دے رہی تھی اور گوتم اپنے خواب کے اثر سے حیران، اپنے بستر پر لیٹا ان آوازوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ فجر کی اذانوں سے اسے گھبراہٹ محسوس ہوتی تھی کیوں کہ ایک ساتھ کئی مؤذنوں کی آوازیں گھل مِل کر ایک خوف ناک مبہم اعلان بن جاتی تھیں۔ وہ اکثر ان کے مقصد پر غور کرتا، کہ اگر مقصد خدا کی وحدانیت کا اعلان ہے تو کیا کوئی سمجھوتا نہ طے ہو پاتا، ایک وقت مقرر ہو جاتا۔ مگر جہاں تک اس کا فہم محدود تھا، وہ ان اذانوں کو انا پرست فرقوں کی ایجاد سمجھتا تھا، جس میں یہ آوازیں ان کے وجود کے ہونے کا اقرار تھیں۔ گوتم کا سر درد کر رہا تھا۔ اس نے خیالوں کی رو سے معذرت طلب کی اور کروٹ بدل کر کچھ دیر خوابوں سے پاک نیند کی فریاد کی۔

اگلے چند روز، اس کی زندگی کا محور امام بارگاہ، مجلس و جلوس بن گئے۔ ابھی گوتم نے عقیدت اور روایت میں فرق کرنا نہیں سیکھا تھا۔ وہ حسبِ عادت، صبح اپنے والد کے ساتھ امام بارگاہ جاتا اور رات کی مجلس کی تیاریوں میں ہاتھ بٹاتا۔ اس کے والد کی ایک چھوٹی سی دکان تھی، جس کی کمائی سے وہ سارا سال محرم کے لنگر کے لیے بچت کرتے۔ مگر محرم کے دس دنوں میں اس دکان کے دروازے پر تالا لگتا، اور کرم حسین رات دن، ذوالجناح کی خدمت میں خود کو مصروف رکھتے۔ اگر ان سے کوئی اس خدمت کی وجہ پوچھتا تو وہ بہت معصومانہ انداز میں اِسے اپنا دینی اور قومی فریضہ بتاتے۔ دینی فریضے کی نسبت پر شاید چند جدّت پسند ہی سوال اٹھاتے اور بدعت کے تمغے سے نوازتے، مگر زیادہ تر لوگوں کو ان کے قومی فریضے والی نسبت پر اچنبھا ہوتا تھا۔ ہکلاتے ہوئے جملوں سے جب وہ اس بات کی وضاحت طلب کرتے تھے تو کرم حسین دورِ قدیم کے داستاں گویوں کے مانند، خواجہ حسن نظامی کی کتاب میں رقم قائد کے دادا سے منسلک قصہ ڈرامائی جوش و خروش سے سناتا تھا۔ اس داستان کے مطابق یہ قوم اپنی آزادی کے لیے ایک ذوالجناح کی مرہون منت تھی۔ اس لیے کرم حسین اس کو اپنی قومیّت کا حصہ سمجھتا تھا۔ چند انتشار پسند پھر کبھی اس کے بیٹے کے نام کی نسبت سے اسے چھیڑتے، تو کرم حسین اپنا سر گرائے، ذوالجناح کی مالش میں مصروف ہو جاتا تھا۔

کرم حسین کی شرم ساری دیکھ کر، یہ باتیں بنانے والے اس نام کا بوجھ اس کے سر کر بیٹھتے تھے۔

انسانوں کی سب سے بڑی خیالی حماقت یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ احساسِ جُرم، مجرم کی ملکیت ہے۔ یہ بھول جاتے ہیں کہ احساسِ جُرم نسل در نسل، ورثے میں دیا جاتا ہے۔ مجرم سے زیادہ، اس جُرم کے سائے، اس احساس کی شدت کو محسوس کرتے ہیں۔ گوتم، کا نام جُرم نہیں تھا بلکہ وہ خود بھی اس کو خمیازے کی نظر سے پہچانتا تھا۔ اس کے دادا صابر حسین نے، بائیس سال کی عمر میں، تقسیم ہند کے وقت کرم حسین کی ماں کو ایک ہندو کے ہاتھوں ذبح ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد جب وہ لاہور پہنچا تو اس کا شیر خوار بچہ ایک کم سن، پندرہ سال کی ہندو لڑکی نے اٹھایا ہوا تھا اور وہ 'دت ہاؤس' نامی خالی مکان میں رہنے لگا۔ کرم حسین کی ماں کے جائے قتل سے لے کر لاہور کے اس نسبتاً جلے ہوئے مکان تک کے سفر کی کہانی، اس گھر کے مکینوں نے بُھلا دی تھی۔ اس مکان کے آنگن میں خون کے دھبے آج بھی غور کرنے پر دکھائی دیتے تھے۔ گوتم کی پیدائش کے وقت تک، صابر حسین احساسِ جُرم کی شدت سے سٹھیا گیا تھا۔ وہ رام ورحیم الاپتا گھر کے آنگن میں بے ساختہ دوڑتا رہتا۔ وہ اپنی بیوی کو اپنے دیے ہوے نام، سکینہ بیگم سے مخاطب نہ کرتا تھا بلکہ اس کو اس کے اپنے دیے ہوئے نام کانتا بیگم، سے پُکارتا تھا۔ ان جرموں کا خمیازہ، جو صرف صابر حسین اور کانتا بیگم یا ان کا خدا جانتا تھا، گوتم کے نام سے ادا کیا گیا۔ کانتا بیگم، ذاتی حیثیت میں نہ تو برہمن تھی نہ حسینی، مگر دت ہاؤس کی نجی دنیا نے اسے اس معمے سے نوازا تھا۔ وہ اپنی آخری عمر میں، دھیمی سی آواز میں، غازی کے عَلَم کے پھریرے کے سائے میں بیٹھی یہ نوحہ پڑھتی رہتی تھیں:

بھارت میں اگر آجاتا، ہردے میں سما جاتا
یوں چاند محمد ﷺ کا، دھوکے میں نہ مارا جاتا
نہ بازو قلم ہوتے، نہ پانی بند ہوتا
گنگا کے کنارے، غازی کا علم ہوتا
اس دیش کی بھاشاؤں میں بھگوان پُکارا جاتا

گوتم آج اسی عَلَم کے سائے میں کھڑا، دسویں کے جلوس کو دیکھ رہا تھا۔ صابر حسین اور نقوی صاحب ذوالجناح کی لگام لیے، جلوس کے درمیان موجود تھے۔ یہ دو آدمی، دو مختلف دنیاؤں سے تعلق رکھتے تھے، مگر

حسین علیہ السلام کے در پر، نظرِ عقیدت میں برابر تھے۔ ماتمی حلقے ذوالجناح کے گرد دائرہ بنائے، پُرسا دے رہے تھے۔ چند سکھ اور ہندو محلے والے سبیلیں لگائے ان عزاداروں کی خدمت میں مصروف تھے۔ ایک سبیل کے قریب، کھمبے سے کمر لگائے ہری کھڑا عَلَم کو سلام کرتا نظر آرہا تھا۔ اس نے گوتم کو اپنی طرف آتے دیکھا، اور ایک شرارت انگیز، مانوس مسکراہٹ سے اسے چھیڑا:

''تم پُرسہ دار کافر ہو یا سبیل لگانے والے؟''

گوتم، مسکرایا: ''میں آج کل نہ ہونے کا قائل ہوں۔'' اس نے بھی ایک عُمر گزاری تھی کفر و حق کے خیال کو پرکھتے۔

''تمہارا نام تمہیں اس وجودی حالت کا حق دیتا ہے؟''

''شاید صحیح کہتے ہو ہری، یہ تم جیسوں کی راج دھانی ہے۔ تم حارث والا ہری ہو یا ہری شنکر والا، اس کا فیصلہ مشکل ہے، اور اس مشکل میں شامل تمہاری خیالی آزادی ہے۔ میں اکثر اپنے نام کے بوجھ پر غور کرتا ہوں، سوچتا ہوں اگر صرف گوتم ہوتا یا صرف حسینی ہوتا، تو شاید کسی مقصدِ حیات کا حامل ہوتا۔ فقط حسینی ہوتا تو ان عزاداروں کے ہجوم میں پُرسہ دیتا یا پھر کسی جدّت پسند جماعت میں جہادی بنا بیٹھا ہوتا۔ لیکن میرا نام فقط گوتم ہوتا تو میں شاید ان سب کے ہم راہ ایک سبیل لگاتا یا پھر سرحد پار کسی مسلمان کا قاتل ہوتا۔''

''ان میں فرق کیا ہے؟ دونوں کے شدّتی تصور آخر میں صرف ہمیں ایک قاتل ہی تو بنا چھوڑتے ہیں۔ اب تم چاہے چھری چلانے سے پہلے رام چِلاؤ یا رحیم چِلاؤ، خون تو آخر تمہارے دامن پر ہے۔ تمہاری نجات ان ناموں کی دست برداری میں نہیں، بلکہ حدودِ ذات سے انکار میں ہے۔ تم آریا پار کے فلسفے کے قائل ہو۔ انسان multitudes میں تخلیق پاتا ہے۔ اپنے وجودی اختلافات، انسانی تنوع سے گھبراؤ نہیں۔ اس میں بقا ہے۔''

ایک اونچی گولی کی آواز سے بننے والی بھگدڑ نے گوتم کو ہری سے علیٰحدہ کر دیا تھا۔ لوگوں کا ریلا اسے دھکیلتا اس کے گھر کی گلی میں لے آیا جہاں اس کا باپ، شہید ذوالجناح کی لاش کے آگے سر گھٹنوں پر رکھے رو رہا تھا۔ گوتم نے اپنے باپ کے قریب جانا چاہا مگر اس کے ملنے سے پہلے ایک پندرہ سال کے لڑکے نے اس کے باپ

کے سر پر گولی ماری۔ گوتم وہاں ساکت، اپنے ذہن میں کندہ فلسفوں کو پرکھ رہا تھا، اس احساس کو ابدی زمانوں میں ڈھونڈ رہا تھا، مگر اس کا ذہن ایک خالی تاریک کمرے کی مانند تھا جہاں دُور سے چیخنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ خود چیخ رہا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ کس لمحے اِس کا جسم اُس بچے پر لپکا اور کیسے اس نے پستول کے سرے کو زور زور سے اُس کے سر پر مارنا شروع کر دیا۔ وہ اس احساس سے بھی بے خبر تھا کہ بچہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

گوتم اب ایک پولیس وین میں بیٹھا کانتا بیگم کا دوہڑا پڑھ رہا تھا۔ پولیس وین کنال کے اُوپر سے گزر رہی تھی اور گوتم ایک موہوم مسکراہٹ لیے، خیالوں کے غلبے سے بے خبر ایک نئے سفر پر گام زن تھا۔

معروف تاج

بریٹینیا

شام ڈھل چکی تھی اور بمبئی کی ایک اور دل رُبا رات اپنے رہنے والوں پر سحر برپا کرنے کو تھی۔ آج عام دنوں کے برعکس صفیہ اپنی نئی ساڑھی پہننے پر اصرار کر رہی تھی۔ اور حسن عام دنوں کی طرح اس کے بننے سنورنے سے جڑے فیصلوں کی ناکام مذمّت کر رہا تھا۔

"بھئی جیسے ہو، کیا ویسے خوب صورت نہیں؟"

حسن کو بننا سنورنا برا تو نہیں لگتا تھا، البتہ وہ اسے بے تُکا ضرور سمجھتا تھا۔ اور ویسے بھی اس ساڑھی کو نئی ساڑھی کہنا اب بس گھر کی روایت میں شامل ہونے والا تھا۔ صفیہ اکثر سوچتی کہ اب اسے اس سڑی ہوئی ساڑھی کو گھر سے نکال دینا چاہیئے۔ لیکن زبردستی حسن کی بے فکر مسکراہٹ اپنی آنکھوں کے سامنے لے آتی اور پھر خود اپنی اہمیت محسوس کرنے کی کوشش کرتی۔ یہی سوچتے ہوئے وہ ساڑھی اپنے بائیں بازو پر لٹکائے غسل خانے میں داخل ہو گئی۔

ٹھک ٹھک ٹھک۔ "میں۔۔۔ تانگا لے کر آتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے حسن گھر سے نکل گیا۔

صفیہ زری کے کام والی پھول دار ساڑھی پہنے کرسی پر بیٹھی انتظار کر رہی تھی۔ میز پر کاغذوں کے پھولوں کا گل دان پڑا تھا۔ اور ساتھ ایک شیشے کی بوتل جوانی کو پہنچنے کو تھی۔

حسن نے دروازہ کھول کر منڈی اندر ڈالی اور صفیہ کو بلا لیا۔ صفیہ اٹھی اور۔۔۔

"سنو۔۔۔"

حسن نے شیشے کی بوتل کی طرف اشارہ کیا۔ صفیہ نے بوتل اٹھا کے حسن کو پکڑائی جو اس نے جیب میں ڈال لی۔

دونوں تانگے کے پیچھے بیٹھے اور بریٹینیا کی جانب چل دیے۔

"آپ نے افسانہ اٹھالیا تھا؟" صفیہ کی ملائم آواز گنگنائی اور حسن نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیوں؟"

"وہ ندیم بھی آیا ہو گا نا، پھر سے بھاشن شروع کر دے گا۔۔۔ جیسے خود تو وہ پیڑ پہ اُگا تھا۔۔ بھئی ہر کوئی ایک قُدرت کے نظام سے آیا ہے۔ یہ کیسا راز ہے جس پہ پردہ ڈالوں؟"

صفیہ اس کی بات سے متفق تو نہ تھی لیکن حسن سے دماغ بھڑانے کی طاقت بھی نہ رکھتی تھی۔

تانگہ بریٹینیا کے سامنے رکا۔ سڑک کی بتیاں جل رہی تھیں۔ دُکانیں کھلی تھیں۔ موٹریں چل رہی تھیں۔ اندر سے لوگوں کے بات کرنے کی دھن اور کچھ سازوں کا شور آ رہا تھا۔ حسن کا سفید کرتا شلوار چمک رہا تھا۔ اور اس کی عینک میں بتیوں کا عکس ٹمٹما رہا تھا۔ اسی اثنا میں دونوں بریٹینیا میں داخل ہو گئے۔ بریٹینیا پہلے سے بہت بدل گیا تھا۔ پہلے تو بس کُرسیاں، میز، اور پنکھے ہوتے تھے۔ لیکن اب بریٹینیا کی روشنیوں کے سامنے باہر کا اُجالا، اندھیرا محسوس ہوتا تھا۔ ان کے داہنی طرف ایک سٹیج پر انگریزی سازوں کا تانتا بندھا تھا۔ بائیں طرف کاؤنٹر پر بوتلوں کی دیوار جمی تھی۔ حسن کی بوتل اگر اس کے ہاتھ میں ہوتی تو شاید شرم سے سوکھ جاتی۔ ہر ٹیبل پر کوٹ پہنے جوان بیٹھے تھے۔ حسن کی آنکھیں اپنے ساتھیوں کو ڈھونڈ رہی تھیں کہ اسے کسی کا ہاتھ اپنے بازو پر محسوس ہوا۔ صفیہ کی منڈی اوپر کو اُٹھی ہوئی تھی۔ اوپر والے فلور پر ایک میز پر کچھ لوگ بیٹھے انہیں اوپر بلا رہے تھے۔

حسن سیڑھیاں چڑھ کے اوپر پہنچا۔ پیچھے پیچھے صفیہ بھی آ گئی۔

"آیئے آیئے منٹو میاں، کہاں رہ گئے تھے۔ کب سے راہ تک رہے ہیں آپ کی"۔ اشوک نے حسن کا استقبال کیا۔

"صفیہ کیا بات ہے بھئی، مانا کہ دیر سے آنا عزّت کی نشانی بن گیا ہے، لیکن اتنی دیر۔۔۔" یہ کہہ کہ عصمت کِھل کھلا اُٹھی اور سب نے وقت کی مناسبت سے اس کا ساتھ دیا۔

صفیہ شام کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ندیم نے منٹو کے لیے اپنی جگہ چھوڑنا چاہی لیکن حسن نے اس کے کندھے پر

ہاتھ رکھ کر اسے روک لیا۔

"بیٹھیں جناب، آپ کیوں زحمت کرتے ہیں۔ ہم لاہور والوں کو کہیں کھڑا نہیں ہونے دیتے۔" اشوک اور عصمت ہنس پڑے اور کرشن زبردستی ہنسا۔ منٹو ہونٹوں پر ہلکی سے مسکان دابے بنی سے نیچے دیکھنے لگے۔

"بھائی صاحب۔۔۔ ایک کُرسی لگوادیں۔" ویٹر نے سر ہلایا اور کرسی لینے چلا گیا۔ نیچے سٹیج کے قریب ایک میز پر ایک جوڑا بیٹھا تھا۔ لڑکے نے اس کا ہاتھ بڑی زور سے پکڑ رکھا تھا اور اپنا جوتا اتار کے اپنا پیر اس کی سینڈل میں گھسایا ہوا تھا۔ عصمت کی نظر منٹو پہ پڑی اور اس کی نظر کو دیکھتے ہوئے نیچے بیٹھے جوڑے پہ گئی۔ لیکن جلد ہی عصمت صفیہ سے باتیں کرنے لگی۔

عجیب بات تھی کوئی سگریٹ نہیں پی رہا تھا۔ پہلے تو ہر کوئی پیتا تھا۔ لیکن پہلے یہاں اتنا نمائشی اثاثہ بھی تو نہیں تھا۔ ہوٹل کا پارسی مالک بوتلوں کی دیوار بنانے کو معیوب سمجھتا تھا۔ اور اب جب کہ اس کی موت کے بعد بیٹے آزاد تھے، ہر وہ چیز جس پہ پہرا لگا ہو سکتا تھا، اس ہوٹل کی خصوصیت بن چکی تھی۔

"ہائے عصمت آپا چٹھیوں کا تو پوچھو نہ۔ میں تو کہتی ہوں اگر ان کے افسانوں کی جگہ وہ چٹھیاں چھپی ہوتیں تو شاید وہ سب جیل میں ہوتے۔" صفیہ کی آواز نکلی۔ ویٹر نے کرسی لا رکھی۔ کرشن اپنے کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا۔ شام بڑے انہماک سے عصمت اور صفیہ کی باتیں سن رہا تھا۔ ندیم کی نظر منٹو کے بالوں کی طرف تھی جو ابھی بھی اسی جوڑے کو تاک رہا تھا۔ اگر منٹو اس وقت مڑتا تو دونوں کی آنکھیں چار ہو جاتیں۔

اشوک: آجائیں سرکار، حلق سوکھ رہا ہے۔ اب آپ کے آنے کے بعد بھی انتظار کریں کیا؟

منٹو نے بازو چڑھائے اور کرسی پر ایک ٹانگ چڑھا کے بیٹھ گیا۔ "نہیں نہیں، شروع کریں، ہم کہاں روک سکتے ہیں آپ کو۔"

اشوک: لاؤ پھر شروع کریں۔

اشوک نے ویٹر کو اشارہ کیا۔

عصمت: بھول ہے صفیہ کہ وہ بھی کبھی جیل جائیں گے۔	ندیم: لاہور آنے کا کوئی ہے ارادہ؟

صفیہ عصمت سے کچھ اسی طرح کے منفرد جواب کی امید رکھ رہی تھی۔ سو اس نے زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن عصمت کے دل کو شاید سکون نہیں ملا تھا، سو وہ بولی،

"سرکار کو مسئلہ اس سے نہیں کہ منٹو کی کہانیاں فحش ہیں، یا، میری کہانیاں ایسی ہیں۔ وہ صرف اس طبقے کو خوش رکھنا چاہتے ہیں جن سے ان کی حکومت قائم رہے۔"

صفیہ اپنا سر ہلا رہی تھی اور شام میز پہ بازو فولڈ کر کے ان پر اپنا سر ٹکائے بیٹھا عصمت کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

صفیہ: ہاں۔ ویسے مجھے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ کالی شلوار، یا بو، یا لحاف کو ہی پڑھ کے، اگر کسی کا دل۔۔۔

عصمت: نہیں نہیں۔۔۔نا۔۔نا۔۔۔

صفیہ: کیوں کہ اگر اس سے کوئی۔۔۔۔

عصمت: شش، ششش، سُنو۔۔

صفیہ: یہ تو شاید۔۔۔

عصمت: ارے منٹو صاحب، کہیں آپ بھی تو نہیں پھنسے ہوئے اس فضول کی بحث میں۔

منٹو کی کانوں تک شاید یہ آواز نہ پہنچی تھی۔

عصمت: صفیہ بانو، دیکھو۔۔

عصمت نے صفیہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

منٹو: ابھی تو نہیں۔۔۔ ویسے آپ کا یہاں کیسے آنا ہوا؟

ندیم: تحریک کے سلسلے میں ہی آئے تھے۔ سوچا آپ سب سے بھی ملتا چلوں۔

منٹو نے سر ہلایا۔ ندیم اپنا اگلا جُملہ تیار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کرشن: آپ کا نیا افسانہ پڑھا ابھی میں نے۔ اچھا ہے۔ ویسے جو بھی کہیں، ان افسانوں کی زبان بہت اثر انداز ہے۔ چیکوو اور کافکا سے بڑے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔

ندیم: بالکل، زبان کی اثر اندازی کی تو میں بھی تائید کروں گا۔ لیکن کرشن میرے خیال میں جو مضامین اور کردار ابھی ان کہانیوں کے مرکز ہیں، وہ موجودہ حالات کے لیے شاید موضوع نہ ہوں۔

منٹو مسکرا رہا تھا۔ ویٹر نے بوتل لا کر میز پہ رکھ دی اور اشوک سے رہا نہ گیا۔ بوتل کھولتے ہوئے بولا: ہوں۔۔ ویسے بات تو صحیح ہے، یہ ابھی جو افسانہ چھپا ہے، کیا نام ہے۔۔۔ اوئے ہوئے، کیا نام تھا۔ یار حال ہی میں تو پڑھا تھا۔

کرشن: "بو"؟

عصمت: کچھ محسوس۔۔۔

اشوک: "بس پتلون ڈھیلی ہو جاتی ہے۔۔"

شام اور عصمت نے آخری کا حصّہ سنا اور زور سے قہقہ لگا چلے۔

عصمت: اچھا تو، ہاں۔۔۔ کچھ محسوس ہوا؟ ہوا کچھ؟

صفیہ نے نفی میں سر ہلایا۔

عصمت: اب دیکھو، شام ہاتھ دکھاؤ۔

عصمت نے دونوں کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے۔

عصمت: تمھیں ہوا کچھ؟

شام کو ساری بات سمجھ تو نہیں آ رہی تھی مگر وہ جانتا تھا کہ یہاں صحیح جواب "نہ" کہنا ہی ہے۔

عصمت نے صفیہ کو مخاطب کیا۔ "کیوں؟"

عصمت نے شام کا ہاتھ چھوڑا اور صفیہ کی ہتھیلی کا ماس پکڑ کے کھینچنے لگی۔

"کیوں کہ یہ وہ چیز نہیں ہے جو سنسنی پیدا کرتی ہے۔"

شام نے دو گلاس آدھے بھر کے عصمت اور صفیہ کے سامنے رکھ دیے۔ عصمت نے اپنا ہاتھ ایک تانترک کی طرح صفیہ کے سر کے اوپر پنجا کھول کے رکھ دیا اور آواز بھاری کر کے بولی۔ "یہ وہ بلا ہے۔"

عصمت کھکھلا کے ہنس پڑی۔

منٹو اس وقت اشوک، کرشن اور ندیم کی باتوں میں گُم تھا۔

اشوک: ہاں ہاں "بُو"، اب اسی افسانے کو لے لو، نہ اسے پڑھ کے کوئی جذبہ ملتا، نہ ہی ترقی پسند تحریک میں آتا، بس پتلون ڈھیلی ہو جاتی ہے۔

شام اور عصمت نے آخری کا حصہ سنا اور زور سے قہقہ لگا چلے۔

اشوک: اب یہ بھی کوئی افسانہ ہوا؟

منٹو نے گلاس سے آخری گھونٹ لی اور جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکال لی۔

ندیم: نہیں اب تم کسی اور سمت میں بات کو گھماؤ گے تو پھر تو نہیں بنے گی نا بات۔

ڈبی سے سگریٹ نکال کر اپنے ہونٹوں میں رکھی اور ماچس نکال لی۔

ویٹر:

(Excuse me, sorry sir, we are not allowing our guest to smoke within the hall. If you want to smoke, you can visit the gallery.)

منٹو نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ارد گرد مینجر اور باقی ویٹر بھی کھڑے تھے۔ ندیم، شام، اور کرشن کی نظر بھی اسی پر جمی تھی۔

اشوک: لو بھئی ندیم میاں، بمبئی کی طرف سے ان صاحب کو شامل کر لو۔ دشمنوں کے ہتھیار تو یہ سیکھ ہی چکے ہیں، باقی کچھ آپ لوگ بھی سکھا دیجیے گا۔

عصمت: اچھا وہ، اپنی بیٹی کا سناؤ، کتنی بڑی ہو گئی ہے؟ اسے بھی لے آتے یہاں؟ صفیہ: جی بس پتہ نہیں یہاں لانا مناسب ہوتا۔ عصمت: ہوں۔۔۔ صفیہ: اور سچ، نور نہیں آئیں؟ سب کی نظر اس ویٹر اور منٹو پر تھی۔	منٹو: نہیں، کیوں، ابھی کیوں نہیں پی سکتے یہاں؟ ویٹر: سر، ہوٹل کو ائیر کنڈیشنڈ کر دیا گیا ہے۔ اس سے باقی مہمانوں کو تکلیف ہو گی۔ منٹو: تو، یہ آپ کو پہلے کہنا تھا نا، کیا، کہاں ہے وہ، کیا ہے کہیں نو سموکنگ کا نشان۔

عصمت اور صفیہ جانتے تھے منٹو اب رُکنے والا نہ تھا۔

عصمت: اچھا اچھا، مجھے بھی ابھی کچھ باہر کی ہوا چاہیئے، میں چلتی ہوں تمھارے ساتھ۔

ہر کسی نے اپنے آپ کو اپنے گلاس میں مصروف کر لیا۔ دونوں اُٹھ کر گیلری میں چلے گئے۔

عصمت اور منٹو اٹھے اور اوپر ہال سے نکل کر گیلری میں آ کھڑے ہوئے۔ چند پودوں کے گملوں کے علاوہ، یہاں تین کرسیاں، کچھ شادیوں پہ لگنے والی بتیاں، ایک پُرجوش بازار، ایک چاند اور کھلا آسمان موجود تھا۔ منٹو نے جیب سے ڈبی نکالی اور عصمت کے آگے کر دی۔ عصمت نے ایک اٹھائی اور اپنے ہونٹوں میں دبا لی۔ منٹو نے بھی ایک سگریٹ ہونٹوں میں اٹکائی اور ماچس سے پہلے عصمت	سب اشوک کی بات سننے لگے۔ شام اور صفیہ قدرے خاموش بیٹھے تھے۔ نیچے انگریزی ساز سا معین کے لیے بہت زور زور سے چیخ رہے تھے۔ ان دنوں جیز نامی میوزک نچلے درجے کے لوگوں میں مقبول ہو گیا تھا۔ بہتر ہی تھا۔ کب تک انسانوں کی آواز سے گزارہ کرتے۔ آ، آ، آ سے آخر کبھی نہ کبھی تو تھکنا ہی تھا۔ اب انسان کو کبھی کبھار موسیقی سے سکون کی بھی امید ہوتی ہے۔	اشوک: تو کیا خیال ہے؟ اچھے مضامین لکھے گا۔ کرشن: بس کرو یار اشوک۔ ایک اتنے اچھے لکھاری کا فن کہاں ضائع کروا رہے ہو۔ تم سب کی وجہ سے ایسی چیزیں لکھ رہا ہے۔ ورنہ اتنا خوں خوار قلم اگر تحریک ہند میں ہوتا تو شاید غدر میں ہی انگریز بھاگ چکے ہوتے۔ اب چلو نہیں لکھنا ویسا نہ لکھو، پر کچھ صحت مند تو لکھو۔ ندیم ہلکا سا اس بات پہ کچا ہوا کہ شاید اس کا قلم ابھی کافی معصوم ہے۔

کی سگریٹ جلائی اور پھر اپنی۔ کچھ لمحوں بعد عصمت نے ہی خاموشی توڑی۔

"کافی چرچا ہو رہا ہے تمھارے افسانوں کا۔"

"اچھا۔وہ کیسے؟"

"اتنے خط جو آرہے ہیں چاہنے والوں کے"۔عصمت نے ہنستے ہوئے کہا۔

دونوں بنی پر ہاتھ رکھے نیچے گلی میں چلتے پھرتے کتوں کو دیکھ رہے تھے۔ بیچ بیچ میں اکّا دُکّا خواتین بھی نظر آجاتی تھی۔

"تمھیں وہ نظر آرہی ہے؟"

"وہ برقعے والی؟"

"ہوں"

"ہاں۔"

"وہ خاتون نہیں ہے۔"

منٹو نے عصمت کی طرف دیکھا جیسے اسے معلوم تھا جملہ مکمل نہیں ہوا۔ ابھی کچھ بات باقی ہے۔

شام: تو بتایئے۔۔۔ کیسے گزر رہے ہیں روز و شب؟

صفیہ: بس اب تو گزر ہی رہے ہیں۔ انھوں نے حوصلہ تو دیا ہے، لیکن میں اکثر کافی ڈر جاتی ہوں۔

صفیہ کی نظر باہر گیلری کی طرف گئی۔ دونوں ابھی داخل ہی ہوئے تھے۔

شام: ہوں۔۔۔ ویسے سچ بتاؤ تو میں تو آپ سب کی باتیں سن کے ہی ڈر جاتا ہوں۔ نجانے آپ لوگ کیسے اس میں بھی تفریح کا پہلو ڈھونڈ لیتے ہیں۔ مطلب، منٹو اور عصمت خصوصاً۔

صفیہ: ہوں۔۔۔ تمہارا کام کیسا چل رہا ہے؟

شام: بہتر ہے۔ پہلے سے تو۔ ابھی سائیڈ رول ہی مل رہے ہیں۔ لیکن امید ہے جلد ہی، آپ مجھے بھی بڑے بڑے پوسٹروں پہ دیکھیں گی۔

کرشن: تم ندیم کا کام دیکھو۔ ایک عام آدمی کا لکھاری۔ عام آدمی کو طاقت ملے گی تو قوم کو طاقت ملے گی۔ یہ ویشیاؤں کو سر پہ اٹھانے کا کیا فائدہ۔

پھر ندیم کو احساس ہوا شاید اس کا قلم عام ہے۔ شاید یہی اس کی طاقت ہے۔

اب تک منٹو اور عصمت گیلری میں جا چکے تھے سو ان تک آواز جانے کا اندیشہ نہ تھا۔ اور صفیہ کو سب جانتے تھے کہ وہ کبھی پیٹھ پیچھے بات نہیں کرے گی۔

اشوک: دیکھو مانا یہ طاقت واقت کی بات ٹھیک۔ اور میں تمھارے ساتھ ہوں کہ منٹو کو کچھ صحت مند بھی لکھنا چاہیئے۔ لیکن اُس کے نہ آنے کے پیچھے غلطی بھی تو تمھاری ہی ہے۔وہ تو۔۔۔

کرشن: نہیں، ہماری غلطی کیسے؟ اور ہماری سے کیا مراد ہے تمھاری؟

اشوک: اچھا جیسے تمھیں تو کچھ پتا ہی نہیں ہے؟

"وہ عورت ہے۔"
ایک وقفے کے بعد جب اسے محسوس ہوا کہ اس بات کی وضاحت درکار ہے، عصمت نے بات بڑھائی۔ "تمھیں پتہ ہے عورت لفظ کا مطلب ہی کیا ہے؟"
"عورہ" منٹو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"عورہ۔۔۔ تو جب کسی کا مطلب ہی ایک ڈھانپنے کے قابل چیز ہو تو لوگ تو رہیں گے نہ اس کے خبط میں۔"
منٹو نے اس سے پہلے عصمت کے ساتھ اکیلے میں گفتگو کی تھی لیکن یہ کچھ زیادہ ہی مختلف تھی۔ عصمت حال ہی میں ودیش سے ہو آئی تھی تو کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ بہ ہر حال وہ جانتا تھا کہ عصمت اسے اپنے سے اوپر سمجھتی ہے جو اسے ناپسند تو تھا مگر بُرا بھی نہیں لگتا تھا۔

صفیہ: ہاں ہاں، انشاءاللہ۔
شام کے چہرے سے ایک عجب کیفیت گزری جو صفیہ نے بھی محسوس کی۔
صفیہ: تم پر یقین ہے مجھے۔
شام: کیوں۔
شام ہنس دیا اور صفیہ کے سامنے پڑے بھرے گلاس کو دیکھنے لگا۔
صفیہ: بس۔ تم اُن کی طرح نہیں ہو نا۔ دنیا سے بے نیاز۔
صفیہ نے آخری جملہ ہولے سے کہا۔
صفیہ نے اپنے سامنے پڑے گلاس کو دیکھا۔ گلاس اور صفیہ کی بھی کہانی دلچسپ تھی۔ گرچہ وہ پیتی نہ تھی، لیکن احباب کے مسلسل اصرار پر وہ گلاس اپنے سامنے رکھ لیا کرتی تھی۔ باقی سب کا کہنا تھا کہ اس سے انھیں ہمت ملتی ہے۔ ورنہ محسوس ہوتا ہے جیسے ایک جنّتی ان کے درمیان بیٹھا سب کا مذاق اڑا رہا

کرشن نے ندیم کی طرف دیکھا جو خاموش تھا لیکن اتنا حیران نہیں تھا۔
کرشن: نہیں کیا، بات ہے کیا۔۔۔
اشوک: کرشن بس کرو، تم تحریک کے اہم کارکنوں میں سے ہو اور تمھیں کچھ نہیں پتا۔۔۔
کرشن خاموش۔ ندیم نے ایک گھونٹ بھری۔ اشوک نے گلاس بھرا۔
اشوک: یہاں آ کے دوسروں کو اپنے ساتھ جوڑنے سے پہلے اپنے لوگوں کو تو ساتھ رکھ لو۔
نہ جانے اشوک ندیم سے مخاطب تھا یا کرشن سے۔
اشوک: یاد ہے پچھلی بار، اور آخری بار، منٹو اجلاس میں گیا تھا؟
کرشن نے سر ہلا دیا۔
اشوک: تو۔۔۔ جب جناب نے پڑھ لیا افسانہ، وہ۔۔۔ کالی شلوار۔۔۔ تو آپ کے صدر صاحب اپنی طرف سے تنقید کر رہے ہیں کہ انھیں بہت خوشی ہے کہ افسانہ ادب کے معیار پر رینگتے

"لیکن یہی تو بات ہے، انسان کی فطرت" منٹو نے کہا۔
عصمت نے جلدی سے منھ سے آخری کش کا دھواں نکالا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے مخاطب ہوئی۔ "نہیں، فطرت تو بدلی جا سکتی ہے۔ اب جیسے۔۔۔"
"نہیں جیسے لحاف ہے۔ تم نے بس جنس بدل دی، فطرت تو وہی رہی۔"
"منٹو۔۔۔ تم سے میں بہتر کی امید رکھ رہی تھی۔ مانا دونوں کچھ الگ کر رہے تھے، لیکن وہ بھی محض ان کے ذہن کی ایجاد تھی۔"
عصمت نے ایک بھاری کش بھرا۔ دونوں بمبئی کی اس سڑک کو دیکھ رہے تھے۔ نیچے لوگوں کا ہجوم اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر جا رہا تھا۔ نہ جانے کدھر جا رہا تھا۔

ہے۔ اور صفیہ کسی کا مذاق اڑانے کے خلاف تھی۔ سو ایک بھرا گلاس اپنے سامنے رکھنے پر اکتفا کر لیتی۔
شام: "دنیا سے بے نیاز"۔ ہوں۔ کافی بھاری جملہ ہے۔۔۔ اچھا ویسے آپ کیا کر رہی ہیں آج کل۔ کچھ افسانے آپ نے بھی تو لکھے تھے، کیا ہوا۔
صفیہ: ہاں لکھے تھے۔ بس۔۔ پھر۔۔ ٹائم ہی نہیں ملتا۔ منٹو، گھر، بچے۔۔۔
شام: ام۔۔۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔
صفیہ باہر گیلری میں دیکھ رہی تھی۔ شام نے بھی باہر دیکھا۔
شام: انھوں نے کچھ نیا لکھا؟
صفیہ: ہاں لکھ تو رہے ہیں کچھ۔
شام نے صفیہ کی آنکھوں میں دیکھا!
شام: آپ نے پڑھا تو ہو گا؟
صفیہ: ہاں۔۔۔ پڑھا تو تھا۔ ابھی مکمل نہیں ہوا تو پتہ نہیں بتانا چاہیے

رینگتے پہنچ گیا ہے۔
ندیم نے ایک اور گھونٹ لی۔ اس کے چہرے سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ تو جانتا تھا۔
اشوک: منٹو نے اس کا ذکر خود تو نہیں کیا، لیکن کچھ دوستوں سے مجھے بھی پتا چلا ہے کہ وہاں، صدر صاحب کی کچھ گم ہو گئی تھی شاید۔
اشوک نے گھونٹ بھری۔ کرشن کا گلاس خالی پڑا تھا۔
کرشن نے ندیم کی طرف منہ کر کے آہستہ آواز میں پوچھا کہ صدر کون تھا۔
اشوک: فیض۔
کرشن صفیہ کی طرف دیکھ رہا تھا جو شام سے باتیں کرنے میں مشغول تھی۔
ندیم میز پہ رکھی بوتل کو دیکھ رہا تھا۔
اشوک ندیم کی شرٹ کے دوسرے بٹن کو دیکھ رہا تھا۔
کرشن: اشوک اگر کسی حد تک دیکھا جائے تو، وہ بس ، مطلب، فیض کی

”رندھیر[1] سے بھی مجھے یہی شکایت تھی۔ لیکن تم ہو کہ سُنتے ہی نہیں“۔ عصمت بولی۔

منٹو نے بنی سے ہاتھ ہٹا کر اپنے کولہے اٹکا دیے اور اندر شام اور صفیہ کو دیکھنے لگا۔

”تو کیا شکایت ہے تمھاری رندھیر سے؟“

”کچھ نہیں بس۔۔۔“ ایک وقفے کے بعد۔ ”تم نے کرداروں کو جسم کے بازار میں تو دھکیل دیا، لیکن اس کے خبط کو ذرا توجہ نہ دی۔“

کس خبط کی بات کر رہی ہے یہ؟

عصمت بازار کی طرف دیکھ رہی تھی اور منٹو ہال کی طرف۔ ہال میں ہر کوئی نور سے مخاطب تھا۔ شاید کوئی فرمائش کی جا رہی تھی۔ گانے کی ہی فرمائش ہو گی۔ اور وہ بے چاری کر بھی کیا سکتی تھی۔

کہ نہیں۔

شام نے سر ہلایا جیسے اسے یہ کہانی چھپانے والی بات بُری لگی ہو۔ اس نے ایک اور گلاس بھر لیا۔

صفیہ: تم اپنی فلموں کی کہانی بتاتے ہو؟

شام: اس میں کیا ہے۔ ابھی بتا دیتا ہوں۔ ایک امیر بابو ہے۔ ایک گاؤں کی لڑکی ہے۔ چھ گانے ہیں جن میں سے تین ناچ ہیں۔ اب آپ بتائیے؟

صفیہ: ہوں۔۔۔ ویسے کچھ اسی قسم کا ہے۔ گانے تو نہیں ہیں لیکن ہاں، ایک لڑکی ہے، ایک لڑکا ہے۔ لڑکے کا نام میرے خیال سے ایشر کچھ ہے، اور۔۔۔ لڑکی پتا نہیں کوئی کور ہے۔

شام: سکھ ہیں دونوں؟

شام نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

رائے ہے، اس کی رائے کا اسے حق ہے۔ تو۔۔۔ ہاں۔۔

اشوک: بول پڑو تم بھی۔ تم تھے وہاں شاید۔۔۔

اشوک ندیم سے مخاطب ہوا۔

ندیم: ہاں، نہیں وہ بات ٹھیک ہے تمھاری، باقی کرشن کا بھی نقطہ صحیح ہے، اس کی رائے ہے، اور جلسے میں اس طرح ہوتا رہتا ہے۔

اشوک: ندیم میں تم سے آگے کی بات پوچھ رہا ہوں۔ تم بتا دو یا میں بتا دیتا ہوں۔

ندیم: کیا، نہیں، اس کے علاوہ، میرے خیال میں بس یہی تھا۔

اشوک: چلو صحیح۔

سب کے گلاس خالی تھے۔ صفیہ کا گلاس بھرا ہوا تھا۔ شام کی بوتل ختم ہونے کو تھی۔

اشوک: کرشن چندر ہوا کچھ یہ کہ، کالی

[1] منٹو کے افسانے ”بو“ کے مرکزی کردار کا نام۔

حال ہی میں بمبئی آئی تھی اور آواز اور شکل کے علاوہ ابھی تو اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ شکل سے دل بہلاتی تو شاید انھی کی کسی کہانی کا کردار بن جاتی، تو آواز ہی ایک آخری چیز تھی جو عزت سے بیچی جا سکتی تھی۔

"تمھیں لگتا ہے وہ جو نیچے بیٹھا اس کا ہاتھ پکڑ کے ۔۔۔۔ تمھیں لگتا ہے کہ وہ محض ایک لمس ہے جو وہ سب کیفیات پیدا کر رہا تھا؟"

کچھ لمحے خاموشی طاری رہی۔

"ویسے، دیکھو تم مجھ سے زیادہ ماہر ہو، بس حال ہی میں کچھ خیالات میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔۔۔ اور تم سے بہتر کون ہو گا ان خیالات کو آزمانے کے لیے۔"

عصمت نے منٹو کا ہاتھ جو اس نے بنی پر سہارے کے لیے رکھا تھا، اٹھا کر اپنی چھاتی پر رکھ دیا۔ منٹو کی نظر عصمت کی طرف گئی۔ دونوں

صفیہ: ہوں۔

شام: "بو" جیسا تو نہیں کچھ؟

صفیہ: پتا نہیں۔ جسم کی بات کی تو ہے، لیکن ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

شام نے سر ہلایا۔

صفیہ: تم کہو۔۔۔ سچ تم ممتاز کو کیوں نہیں لائے؟

شام: ہاں لانا تھا، ابھی وہ پیٹ سے ہے، تو سوچا ان بو تلوں سے دور ہی رکھا جائے تو بہتر ہے۔

صفیہ نے گردن ہلائی۔

صفیہ: ہاں لیکن کبھی ملوانے لاؤ۔ وہ بھی کتنی اداس رہتی ہو گی۔ تم تو یہاں آ کے دل ہلکا کر لیتے ہو گے۔

شام کا چہرہ مُرجھا گیا۔

صفیہ: کیا بات ہے؟

شام: نہیں کچھ نہیں۔ بس وہ، کچھ نہیں۔

صفیہ نے شام کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

صفیہ: بولو بھئی، کوئی پریشانی ہے؟

شلوار پہ تو بات اُس نے کرنے نہ دی کسی کو۔ جو بھی کوئی بولتا، وہ شکریہ، اور معذرت کر کے آگے چل دیتا۔ لکھاری کو بولنے کا موقع دیا ہی نہیں۔ اور یہ بھی کوئی نہیں۔ اور ندیم، تم بتانا اگر میں کچھ جھوٹ بول رہا ہوں تو، اس سے پہلے، یہ منٹو کا افسانہ پڑھنے سے پہلے، جو تین افسانے پڑھے گئے، اس میں منٹو جس پر بھی بولنے کی کوشش کرتا، اور سامعین میں سے کوئی اس کی تعریف یا تنقید کے لیے کھڑا ہوتا، فیض وہیں بیچ میں بول پڑتا۔ "صحیح"۔ "نہیں بہت شکریہ"۔ "چلیں آگے چلتے ہیں"۔ جیسے جُملے اس کے منہ سے رکتے ہی نہ تھے۔ اور کرشن مجھے نہیں پتا کہ وہ کیا باتیں ہیں جن پر فیض نے اتنی بے رُخی اپنائی، لیکن مجھے اتنا پتا ہے کہ منٹو کی باتیں اتنی بے معنی نہیں ہو سکتی تھیں کہ مکمل طور پر نظر انداز کر کے آگے چل دیا جاتا۔ باقی تمھیں بھی پتا ہے کہ یہ قلم کیسا لکھ سکتا ہے۔

ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ منٹو کا کچھ خیال اندر ہال کی طرف جا رہا تھا جہاں شام اور صفیہ رقص میں مصروف تھے۔ کیا صفیہ دیکھ رہی تھی؟

"کیا کچھ محسوس ہوتا ہے؟"

سگریٹ جل رہی تھی۔ دھواں نکل رہا تھا۔ راکھ گر رہی تھی۔ سگریٹ جل رہی تھی۔

عصمت نے منٹو کا ہاتھ ابھی بھی اپنی چھاتی پر رکھا ہوا تھا۔ باہنی چھاتی پر۔

دونوں کے ذہن میں ایک ہی خیال آیا۔ عورت کی چھاتی کے لیے اردو میں کوئی لفظ ہی نہیں ہے۔ عجیب۔ اگر چھاتی کہہ بھی دیں تو دونوں کو الگ الگ مخاطب کرنے کا بھی کوئی طریقہ نہیں ہے۔ کیا کریں؟ باہنی چھاتی؟ داہنی چھاتی؟ منٹو نے سوچا۔

خیر، عصمت نام کے بارے میں

شام نے اشوک وغیرہ کی طرف دیکھا اور پھر آواز تھوڑی ہلکی کر کے بولنے لگا۔

شام: ممتاز، کو، آ، ابھی، اسے لگتا ہے کہ، جیسے، مطلب، اب جیسے میرا کام، یہ ہے، کیا، فلم کا۔ تو اسے لگتا ہے، کہ جیسے، کہ، میر اشاید کسی اور سے کوئی رشتہ ہے، جو کہ ہے نہیں، لیکن میں، اب مطلب، کچھ کر نہیں سکتا۔ کام تو کام ہے کہ نہیں۔

صفیہ نے گردن ہلائی۔

صفیہ: بات تو صحیح ہے۔۔۔۔ تم تھوڑا وقت اس کے۔۔۔۔

دونوں کے کانوں میں اشوک کی آواز پڑی۔

اشوک: یہ نُور کھڑی ہے نا؟

میرے نزدیک تو منٹو اور عصمت دونوں کی تحریریں اپنے آپ میں ایک تحریک ہیں۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ تم نے پڑھا ہے۔ تو دیکھ لو۔۔۔

اشوک نے جیب سے سگریٹ نکالی۔

اشوک: لکھنے دو اسے جو لکھ رہا ہے۔ تمھیں ملے ہوئے ہیں فیض، فیض یاب ہو ان سے۔ اور جہاں تک بات رہی۔۔۔ یہ نور کھڑی ہے نا؟

اشوک نے نیچے سٹیج کے پاس کھڑی ایک خاتون کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اشوک نے اوپر سے نُور کو آواز لگائی اور وہ اوپر آ گئی۔

اشوک: آیئے آیئے محترمہ، کہاں رہ گئی تھیں۔

نور: بس وہ سٹوڈیو میں دیر ہو گئی، تو مجھے رُکنا پڑا۔ عصمت آپا کو بتا دیا تھا میں نے۔

اشوک: چلیں کوئی بات نہیں، یہاں تھوڑی کوئی حاضری لگ رہی ہے۔

سوچتی رہی، اور منٹو نے عصمت کے سوال کا دوبارہ جائزہ لیا۔

"کیا کچھ محسوس ہوتا ہے؟"

عصمت نے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ جب کہ منٹو کا ہاتھ اس کی داہنی طرف بہت ہی ڈھیلا پڑا تھا۔ جیسے کسی مُردار کا ہاتھ کہیں رکھ دیا جائے۔ عصمت ابھی بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ منٹو آنکھیں ملانا چاہتا تھا مگر نجانے کیوں ملا نہیں پا رہا تھا۔

"کیا کچھ محسوس ہوتا ہے؟" عصمت بولی۔

منٹو کی انگلیاں سخت ہو رہی تھیں۔

"جس میں روز پوجا کرنے کے واسطے سینکڑوں مرد اور عورتیں، سجدہ کرنے جاتے ہیں۔"

ہاتھ ابھی بھی وہیں تھا۔ ہاتھ دباؤ۔ ڈھیلا چھوڑو۔ دباؤ۔ چھوڑو۔ دباؤ۔ چھوڑو۔

"جب کہ حقیقت اس کے برعکس

نُور مسکرا دی۔

نُور: تو۔۔۔ کیا بات ہو رہی ہے۔۔۔ بھئی کچھ مزے دار ہو تو مجھے بھی بتاؤ۔

اشوک: ہاں ہاں، یہ ندیم بھائی اور کرشن بھائی اپنی آپ بیتی سنا رہے ہیں۔ جی، تو پھر آپ کے پیچھے انگریز لگ گئے اور پھر؟

نُور: ہیں؟ پھر کیا ہوا؟

اشوک: بس پھر کرشن نے کاغذ نکالا، ندیم نے کچھ جملے لکھے اور وہ سب بھاگ گئے۔۔۔

نُور کو اب کہیں جا کے طنز سمجھ آیا۔

صفیہ: کیسا رہا آج کا دن؟ کوئی ریکارڈنگ تھی؟

نُور: جی، ایک فلم کے گانے ریکارڈ کیے تھے۔ شام تمھاری فلم کے بھی پروڈیوسر سے بات ہوئی تھی آج میری۔ شاید تمھاری فلم کا بھی کوئی ایک آدھ گانا میں گا لوں۔

شام: واہ بھئی۔ بہت خوشی ہوئی۔ تمھاری پچھلی فلم کے گانے سنے تھے میں نے۔ بہت خوب صورت۔

صفیہ: ویسے میں نے سنے تو نہیں ہیں، لیکن میں ضرور سنوں گی۔

اشوک: ارے لیکن انتظار کس بات کا۔ فن کار ہمارے ساتھ ہیں۔ ابھی سن لیتے ہیں۔

شام: ہاں ہاں، نُور آج اگر اس محفل کی بھی رونق بڑھا دو تو، شام بن جائے۔

نُور سنانا چاہتی تھی بس روایتی لحاظ کرنے کے بعد کھڑی ہو گئی۔ شام کھڑا ہوا اور گلاس بجا کر سب سے مخاطب ہوا۔

شام: تو صاحبان، آپ سب نے مشہور نُور جہاں کے گانے فلموں میں تو سنے

نہیں؟"
عصمت اپنا ہاتھ تو ڈھیلا کرتی تھی
مگر آہستہ آہستہ دوسرا ہاتھ سختی
پکڑ رہا تھا۔
"گوشت نہیں یہ ؟؟؟ٹھنڈا۔۔۔
گوشت۔۔۔"
ایک ہاتھ ڈھیلا تھا ۔ ایک ہاتھ
سخت۔ چھاتی ابھی بھی بھینچی ہوئی
تھی۔ عصمت مسکرا رہی تھی۔
شاید منٹو کو کچھ خیال آیا تھا۔
نور کے نغمے کی آواز دونوں کے
کانوں میں گونج رہی تھی۔

ہوں گے، لیکن آج ہم یہیں ان کی محفل سے فیض یاب ہوں گے۔
ندیم اور کرشن کے ذہن سے ایک خیال گُزرا۔ "فیض یاب"۔
شام کی بات شاید تین چار لوگوں نے سنی ہو گی۔ انگریزی سازوں کو سکون کرنے کی درخواست کی گئی۔ ایک دو ساز اوپر منگوا لیے گئے۔
نُور کو بھی بس موقع چاہیئے تھا۔ نور سازندوں سے کچھ بات کرنے لگی۔ اور پھر شروع ہوئی۔

ہماری سانسوں میں آج تک وہ حنا کی خوشبو مہک رہی ہے،
ہماری سانسوں میں آج تک وہ حنا کی خوشبو مہک رہی ہے،
لبوں پہ نغمے مچل رہے ہیں،
لبوں پہ نغمے مچل رہے ہیں، نظر سے مستی چھلک رہی ہے۔
ہماری سانسوں میں آج تک وہ حنا کی خوشبو مہک رہی ہے،
شام کے اصرار پر صفیہ نے فلور پر اس کا ساتھ دیا۔
وہ میرے نزدیک آتے آتے حیا سے اک دن سمٹ گئے تھے
وہ میرے نزدیک آتے آتے حیا سے اک دن سمٹ گئے تھے
میرے خیالوں میں آج تک وہ بدن کی ڈالی لچک رہی ہے،
میرے خیالوں میں آج تک وہ بدن کی ڈالی لچک رہی ہے،
ہماری سانسوں میں آج تک وہ حنا کی خوشبو مہک رہی ہے،
شام کا ہاتھ صفیہ کی کمر پر تھا۔ صفیہ کا ہاتھ شام کے کندھے پر تھا۔ دونوں کے دوسرے ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں تھے۔
صفیہ: تمھیں ابھی گھر جانا چاہیئے۔ ممتاز کے پاس۔
صدا جو دل سے نکل رہی ہے، وہ شعروں نغموں میں ڈھل رہی ہے،

	صدا جو دل سے نکل رہی ہے، وہ شعروں نغموں میں ڈھل رہی ہے،
	کہ دل کے آنگن میں جیسے کوئی غزل کی جھانجر چھنک رہی ہے،
	کہ دل کے آنگن میں جیسے کوئی غزل کی جھانجر چھنک رہی ہے،
	ہماری سانسوں میں آج تک وہ حنا کی خوشبو مہک رہی ہے،
	صفیہ: تمھیں کچھ محسوس ہو رہا ہے؟
	شام جانتا تھا کیا۔
	شام: کیا؟
	صفیہ تھوڑی کچّی ہوئی۔ صفیہ نے نفی میں سر ہلایا۔
	شام: عصمت کی بات کے بارے میں سوچ رہی ہو؟
	صفیہ: ہوں۔۔۔
	شام: اتنا نہیں سوچا کرتے۔ ایسے لوگ ایسی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ بھول جاؤ بس۔
	تڑپ میرے بے قرار دل کی کبھی تو ان پہ اثر کرے گی،
	تڑپ میرے بے قرار دل کی کبھی تو ان پہ اثر کرے گی،
	کبھی تو وہ بھی جلیں گے اس میں جو آگ دل میں دہک رہی ہے،
	کبھی تو وہ بھی جلیں گے اس میں جو آگ دل میں دہک رہی ہے،
	ہماری سانسوں میں آج تک وہ حنا کی خوشبو مہک رہی ہے
	لبوں پہ نغمے مچل رہے ہیں، نظر سے مستی چھلک رہی ہے
	ہماری سانسوں میں آج تک وہ حنا کی خوشبو مہک رہی ہے

سیّد ارتضیٰ حیدر زیدی

دائمی انجن

سامعین! ایک اعلان سماعت فرمائیں! انسانی اختراعی تجربوں اور غفلت کے باعث زمین رہنے کے قابل نہیں رہی! اب نجات کا ذریعہ ڈاکٹر عبد السلام کا "دائمی انجن" ہے۔

اس اعلان کے ساتھ پُورے شہر میں لوگوں کی چیخ و پُکار کو بھی سُنا جا سکتا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ زبان زدِ عام بس ایک ہی لفظ تھا "دائمی انجن" گویا انسانی بقا کا آخری حل وہی ہو۔ مذہبی پناہ گاہوں اور عبادت گاہوں سے دعاؤں کی آوازیں بلند تھیں اور قیامت کا استقبال کیا جا رہا تھا۔ مگر سائنس دانوں نے اس اثنا میں سب کو برفیلی ہواؤں سے بچنے کے لیے انجن کا راستہ دکھایا۔ ایلیاء، اعلان سُنتے ہی اپنی چھوٹی بہن کو لے کر یتیم خانے سے اپنے کپڑوں کے تھیلے کے ساتھ انجن کی جانب نکل پڑتا ہے۔ راستے میں گھمسان کا رش اور دھکم پیل تھی مگر اپنی چھوٹی بہن کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ ایلیاء کا قد تو چھوٹا تھا مگر اس کے حوصلے نے ان دونوں کو ٹرین کے آخری سیکشن کے دروازے تک پہنچا دیا۔ مگر یہاں تو غریبوں، مسکینوں اور ناداروں کا رش ہے اور کمانڈوز ان پر اپنی بندوقیں تانے ہوئے ہیں۔

کمانڈوز چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے "ٹکٹ کے بغیر داخلہ ممنوع ہے۔" یہ سُنتے ہی ایلیاء کچھ ڈبّے چھوڑ کر آگے کی جانب بڑھتا ہے۔ یہ ٹرین کا دوسرا اور پہلا سیکشن تھا جہاں لوگ آرام سے ٹکٹ دکھا کر سوار ہو رہے تھے۔ لوگوں کے چہرے پر مسکراہٹ، سینوں پر کسی نے اوور کوٹ اور کسی نے برانڈ کی جیکٹ زیب تن کی ہوئی تھی۔ چال ڈھال سے اعلیٰ گھرانوں کے معلوم ہوتے تھے۔ ایلیاء اس سیکشن میں گھُسنے کی کوشش کرتا ہے مگر

ایک کمانڈو کی نظر ان پر پڑ جاتی ہے اور وہ چھوٹی کے سر پر بندوق کا پچھلا حصّہ مارتا ہے۔ وہ زخمی ہو کر گر جاتی ہے۔ ایلیاء کو اس سے الگ کر کے تیسرے سیکشن والے حصّے کی جانب دھکیل دیا جاتا ہے۔ غصّے اور سسکیاں لیتا ہوا یہ بچہ لوگوں کے درمیان پستا ہوا آخر کار "انجن" پر سوار ہو جاتا ہے۔ کمانڈوز باقی رہ جانے والے لوگوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ "انجن" چلنا شروع ہو جاتا ہے اور ریڈیو فریکیونسی سے آواز آتی ہے:

"Welcome to the eternal engine"۔

زمین کا درجہ حرارت ہر گزرتے لمحے کے ساتھ گرتا جاتا ہے۔ انجن کی کھڑکیوں سے باہر جمی ہوئی لاشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس انجن کے باہر اب صرف موت تھی۔ معلوم پڑتا ہے کہ شمال کی جانب پہاڑوں میں کیے جانے والے نیوکلیئر تجربات کے ناکام ہونے کی وجہ سے ایک Side Effect زمین کا درجہ حرارت گراتا جا رہا ہے۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر عبدالسلام اور ان کے سائنس دان "انجن" کی بنیاد رکھتے ہیں کہ جس کے اندر کا درجہ حرارت انسانی زندگی کی بقا کے لیے Maintain کیا گیا ہے یہ ٹرین ایک سرکلر ٹریک پر پوری دنیا میں چلے گی اور اگر یہ رُکتی ہے تو انسانیت کا وہ آخری دن تصور کیا جائے گا۔

تین دن کا بھوکا اور پیاسا ایلیاء کھانے کی گاڑی کو دروازے سے داخل ہوتا دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے۔ کمانڈوز سب کو ڈنڈوں اور بندوقوں سے پیچھے کی طرف دھکیلتے ہیں۔ اتنے میں ایک "Lady Manager" نمودار ہوتی ہیں۔ کسی کمپنی کی CEO کی طرح کا لباس، اونچا قد، جانور کی کھال زیبِ تن کیے ہوئے تھیں۔ وہ آکر ڈاکٹر عبدالسلام کا پیغام دیتی ہے کہ "انجن" کے حصے میں وہ لوگ سوار ہیں جن کے پاس ٹکٹ نہیں ہے اب اگر انھوں نے اس انجن میں رہنا ہے تو ان کے حکم ماننے پڑیں گے۔ بھوک کی تاب نہ لاتے ہوئے سب رضامند ہوتے ہیں۔ اس کھانے اور انجن میں جگہ کے عوض "C" کلاس کہلانے والے یہ لوگ کہیں درزی، چپڑاسی اور کہیں صفائی کا کام کرتے ہیں۔

ایک دہائی گُزر جاتی ہے اب ایلیاء جوان ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کو "Internee" کے طور پر ٹرین کے "B" کلاس سیکشن میں Waiter کا کام ملتا ہے۔ ایلیاء محنت اور لگن سے کام کرتا اور رات کی تاریکی میں اچھا کھانا

لے کر ''C'' کلاس میں اپنے دوستوں اور بزرگوں کو جا کر دیتا تھا۔ یہاں پر ولفرڈ اور Yushfa (یشفہ) اس سے کمانڈوز کی ڈیوٹی کا وقت اور ٹرین کے دوسرے سیکشن کے حالات سے باخبر رہتے تھے۔ ان دونوں کے اندر بغاوت کا ایک جذبہ تھا جو اپنے لوگوں کے حالات کو دیکھ کر ابھرتا تھا۔

''ہم نے سنا ہے کہ ڈاکٹر عبدالسلام کو قتل کر دیا گیا ہے۔''

''ارے خاموش! چُپ رہو۔ یہ نام اب انجن میں نہیں لیا جاتا۔ مجھے نہیں معلوم، مگر خبریں سننے میں آئی ہیں۔''

ولفرڈ نے یہ سنتے ہی کہا: ''تمھیں بھیجا کس لیے ہے۔ ایلیاء ڈاکٹر عبدالسلام تک ہماری آواز پہنچاؤ! کچھ کرو!۔''

''صبر رکھو! کچھ ہی عرصے میں مجھے ''A'' کلاس سیکشن میں Promote کیا جائے گا۔ میری رسائی Control Room تک ہو گی۔ اگر یہ خبر سچی ہوئی کہ ڈاکٹر عبدالسلام کو مار دیا گیا تو تم لوگ حملے کے لیے تیار رہنا۔''

''B'' کلاس میں ایلیاء نے کئی دوستوں کو اکٹھا کر لیا تھا۔ یہاں کے لوگ بھی ''A'' کلاس کی جانب سے آنے والی پالیسیوں کے خلاف تھے۔ مہنگائی اور ٹیکس میں اضافے کی وجہ سے یہ لوگ بھی اب بیزار ہو رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ''B'' کلاس سیکشن متوسط طبقے کے لیے مختص کیا گیا ہو۔ چوری، کرپشن اور لوٹ مار کا بازار بھی گرم تھا۔ کمانڈوز آئے دن کسی پر ظُلم کرتے دکھائی دیتے تھے۔ ہر محکمے کا سربراہ ایک ریٹائرڈ کمانڈو تھا۔ کئی سال گزرنے کے بعد ایلیاء کی محنت اور Performance کی وجہ سے اس کو ''A'' کلاس کا اسسٹنٹ مینجر بنا دیا جاتا ہے۔ اب اس کی رسائی کونسل ممبرز تک تھی۔ ایلیاء جب پہلی مرتبہ ''A'' کلاس میں داخل ہوتا ہے تو اس کی عالی شان آسائشوں کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ یہاں لوگوں کی آرام و آسائش کی ہر شے موجود تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ Elite کلاس کا ڈبّہ ہے۔

کچھ سال گُزرنے تک بھی ایلیاء کو ڈاکٹر عبدالسلام کا پتا نہ معلوم ہو سکا۔ پیچھے ''C'' کلاس میں لوگ

مایوس ہو چکے تھے کہ شاید یہ قیامت اور ناانصافی ڈاکٹر عبدالسلام کی طرف سے ہی ہے اور وہ Elite کلاس کے کارندے ہیں مگر یہ منظر نامہ تبدیل ہونے کو تھا کہ جب ایلیاء ایک کونسل کی ملاقات کے دوران اندر داخل ہوا اور چائے Serve کرنے لگا تو کیا دیکھتا ہے کہ کمانڈو ہیڈ کہتے ہیں:

"خاموش!"

اور ایلیاء کے اندر آتے ہی خاموشی چھا جاتی ہے۔ پانچ رکنی کونسل میں زمین پر موجود امیر ترین انسان شامل تھے۔ کونسل میں چار مرد جن کا تعلق مختلف انڈسٹریز سے تھا اور ایک خاتون رکن تھیں جن کے ماتھے کی شکن سے ان کی بے چارگی کے آثار ظاہر تھے۔ اس کونسل کی صدارت کمانڈو ہیڈ کو کرتے ہوئے دیکھ کر ایلیاء پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ یہ کھوکھلا سسٹم ایک کمانڈو کی پیداوار ہے اور ڈاکٹر عبدالسلام کو واقعی قتل کر دیا گیا ہے۔ اتنے میں ایلیاء کی نظر ایک خوب صورت، کم عمر لڑکی پر پڑتی ہے جو اُس کو دوسری جانب جانے کا اشارہ کرتی ہے۔ اُس کے ذہن میں اِس کی شکل ابھی کچھ یاد کروا رہی ہوتی ہے کہ دروازے کی دوسری جانب سے ایک کمرے کی طرف اُس کو دھکیلا جاتا ہے اور وہ لڑکی کہتی ہے:

"بھائی!"

ایلیاء خوشی کے مارے چلا کر اس کے گلے لگ جاتا ہے۔

"تم زندہ ہو! آخر تم زندہ ہو، مجھے یقین تھا۔"

"جی ہاں! میں زندہ ہوں۔ وہ جو خاتون کونسل ممبر تھیں انھوں نے میری جان بچائی اور اپنی بیٹی بنا کر وہ مجھے "A" کلاس ڈبے میں لے آئیں۔ ایلیاء ان ظالموں میں موجود مسیحا کا سُن کر بہت حیران ہوتا ہے۔ چھوٹی جو کہ ٹرین کی Sub-Engineer تھی، ایلیاء کو تمام حالات سے باخبر کرتی ہے، وہ بتاتی ہے کہ کس طرح "انجن" کے شروع ہونے سے پہلے ہی کمانڈو ہیڈ نے مارشل لاء نافذ کر دیا تھا اور سب کو دھوکے میں رکھا۔ "B" اور "C" کلاس کے حالات بہت بُرے ہو چکے ہیں۔ آئے دن قتل و غارت، ریپ اور چوری کے معاملات سامنے آتے ہیں مگر یہ کونسل ممبرز اپنی عیاش زندگیوں میں مگن ہیں اور دوسری کلاس کے لوگوں کو جانور سمجھتے ہیں۔

ایلیاء یہ سب جاننے کے بعد چھوٹی جس کو Miss Cameron کہا جاتا تھا، اس کے ساتھ انجن کے نقشے اور تمام Information لے کر "C" کلاس جا پہنچتا ہے۔ خفیہ راستوں کی معلومات ان کے لیے سب سے بڑا ہتھیار تھیں۔ اس طرح Revolution کا آغاز اس "C" کلاس سیکشن سے ہوا۔ تمام لوگ چھری، چاقو اور لکڑی کے بنائے ہتھیار لے کر "B" کلاس کی جانب رواں دواں ہو جاتے ہیں۔ "B" کلاس میں لوگ مذہب، ذات پات اور گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ٹرین کو خدا کی رسی سمجھتے ہیں اور انقلاب کو خدا کا قہر۔ جب کہ "A" کلاس نے ان کے دماغوں میں Concept سرائیت کر دیا ہوتا ہے مگر بے کس و لاچار لوگ انقلاب کا حصّہ بنتے ہیں اور کمانڈوز سے جنگ کا آغاز ہو جاتا ہے۔

ایک سال پر محیط یہ جنگ آخر کار اختتام کو پہنچتی ہے کہ جب "A" کلاس اور کمانڈوز جھک جاتے ہیں۔ کمانڈو ہیڈ کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ اب "انجن" کے اندر ایک نئے نظام کا آغاز ہوتا ہے جو کہ انسانیت کے لیے نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) سمجھا جاتا تھا۔ ایلیاء اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ مل کر جمہوریت کے نظام ڈے کا اعلان کرتے ہیں۔ الیکشن کے ذریعے ایلیاء کو سربراہ منتخب کیا جاتا ہے۔ اب تمام کلاسوں کو ختم کیا جاتا ہے اور ایک ہی نعرہ بلند ہوتا ہے:

From Everybody to Everybody, According to Needs

اور "دائمی انجن" پر لال پرچم لہرا دیا جاتا ہے۔ Miss Cameron جو کہ انجن کو سنبھال رہی تھیں باہر کی جانب کچھ ہل چل محسوس کرتی ہیں، اس منظر کو دیکھتے ان کی آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں۔ ان کے سامنے شمالی پہاڑوں کے درمیان ایک برفانی ریچھ (Bear) دکھائی دیا۔ وہ چیختی چلاتی "دائمی انجن" کے Control Room میں جا کر اعلان کرتی ہے۔ آہوں، سسکیوں اور دَم بھرتی آواز سب کے کانوں میں گونجتی ہے:

"دائمی انجن کے باسیو!

باہر زندگی ابھی زندہ ہے!"

مریم عامر

پگ والی مائی "گلّاں"

عید کا چاند نظر آتا ہے۔ ملک کے ہر کونے کی طرح رحیم یار خان کے چھوٹے سے گاؤں سیال پور میں بھی عید کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو گئیں۔ گاؤں کے لوگ خریداری کرنے کے لیے بازار کی طرف روانہ ہوئے۔ انھی میں مائی گلّاں اور ان کی انات بھتیجی شمائلہ (جو پولیو کا شکار تھی) بھی شامل تھیں۔ مائی گلّاں اسے اپنے کاندھے پر سوار کر لیتی۔ شمائلہ نے چوڑیاں لینے پر اصرار کیا تو مائی ایک چوڑیوں والی عورت کے پاس رک گئی۔ اس عورت نے مائی کے لیے بھی چوڑیاں نکالنا شروع کیں تو اس نے "ناں! بندے ور گی کلائی تے چوڑیاں نہیں سجدیاں نیں" کہہ کر منع کر دیا۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب ضیا دور کے بعد گاؤں میں بھی عورتوں کا گھر سے باہر کام کرنے کا رجحان کم ہو گیا تھا۔ لیکن مائی زمینوں کے کھاتوں کے علاوہ باہر کے سارے کام خود کرتی تھی۔ وہ ہر صبح اپنی بھتیجی کو کندھے پر بٹھا کر سکول چھوڑ کر آتی اور شام کو کھیتوں کا کام ختم کر کے واپس آتی اور آنے کے بعد اپنا نام پانچ سو بار لکھتی۔

وہ گاؤں میں جتنی مختلف سمجھی جاتی اتنی ہی پسند بھی کی جاتی۔ اس دور میں عموماً گاؤں دیہاتوں میں مولویوں نے فتویٰ لگایا تھا کہ پولیو کی ویکسین لگوانا حرام ہے کیوں کہ یہ بانجھ پن کا سبب بنتی ہے۔ اس وقت اس بوڑھی مائی نے ہی مولویوں سے لڑائی کی اور لوگوں کو بچوں کی ویکسین لگوانے پر زور دیا۔ ایسی ہی لڑائی اس نے اپنی بھتیجی کے لیے بھی کی لیکن پولیو کی ویکسین کے والنٹریز سے۔

شمائلہ کو شہر دیکھنے کا بہت شوق تھا اور وہ مائی سے کہتی کہ ان فیکٹری والے افسروں سے گنے کی فصل کا سودا کرنے خود چلتے ہیں اور شہر بھی دیکھ آتے ہیں۔ مائی نے زندگی بھر اس گاؤں سے ایک قدم بھی باہر نہیں نکالا

تھا۔ راشد، مائی کا چچیرا بھائی اور دیور دونوں تھا، جس کا بھائی اپنی کم عمر دلہن کو چھوڑ کر بھاگ گیا اور کبھی واپس نہیں آیا، کہنے لگا: ''آہو! ایس عمریں امّاں نوں کِتھے کِتھے ٹرائیں گی۔'' مائی نے بھی راشد کی بات سے اتفاق کیا۔

راشد پُورے گاؤں میں صرف دوناموں سے ہی مشہور تھا۔ پہلا شرابی اور دوسرا حرامی۔ لیکن وہ پڑھا لکھا بھی تھا، کاروبار کی بھی سمجھ بوجھ رکھتا اور گھر کا آدمی بھی تھا۔ شاید اسی لیے مائی نے اس کی ڈنڈی مارنے والی عادت کو نظر انداز کیا تھا۔ لیکن یہ بات گاؤں والوں کو بہت کھٹکتی تھی کہ وہ عورت جو مردوں کی طرح پگ باندھتی ہے، دوسروں کے لیے حق کی بات کرتی اور فرشتہ صفت مولویوں سے لڑ لیتی ہے وہ راشد جیسے نمک حرام کو کیسے برداشت کرتی ہے۔

ایک رات مائی کے گھر چوری ہو گئی۔ فصل کے پیسے کچھ دن پہلے ہی ملے تھے تو کافی بھاری رقم کا نقصان ہوا۔ اگلے دن سارا گاؤں اس کے گھر اکٹھا ہوا اور اس سانحے کا ماتم کرنے لگا۔ وہ بھی خوب روئی اور چور کو جھولی بھر بھر کے بد دعائیں دیں۔ لیکن اگلے دن اس کے چہرے پر ملال کا ایک نشان بھی نہ تھا۔ اس نے لال رنگ کی چوڑیاں پہنیں، شمائلہ کو اپنے کندھے پر سوار کیا اور شہر کی طرف جانے کی تیاری کر لی۔

راشد نے پوچھا: ''تُسی کتھے جا رہے او؟''

وہ کہتی ہے: ''شہر! فیکٹری والے صاحب کول سودا کرن۔''

راشد: ''تُسی کیوں جاندے پئے او؟''

مائی جواب دیتی ہے: ''کیوں؟ میں نہیں جا سکدی؟ چوراں نے میری رقم نوں ہتھ پایا اے، میری زبان نوں نہیں۔''

راشد: ''نہیں میر امطلب آ کہ تہانوں زحمت کرن دی کیہ لوڑ؟ میں جو آں، آپے گل کر لاں گا۔''

مائی: ''زحمت کاہدی، اپنا کم اپنے ہتھاں نال کرنا چاہیدا اے، ایہہ سُنّت اے۔''

یہ کہہ کر وہ شہر کی طرف چل دیتی ہے اور سب سے پہلے بینک جا کر اپنا اکاؤنٹ کھلواتی ہے۔ دستخط کی جگہ پہلی بار اپنا انگوٹھا لگانے کی بجائے اپنا نام لکھتی ہے۔

گُلّاں۔

صدف یاسمین

مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

امتحانات قریب آتے ہی طلباء کے سٹریس لیول کے ساتھ ساتھ جس چیز میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے وہ ہے ''جذبۂ پڑھائی''۔ سردی کے سخت موسم میں دو عدد پاجامے، ایک عدد جرسی، اوپر کوٹ، گلے میں مفلر سر پر ٹوپی، ہاتھوں پر دستانے اور سب سے اوپر لحاف تان کر جب ہم پڑھائی کرنے بیٹھتے ہیں تو سردی بھی دم دبا کر بھاگ نکلتی ہے۔ لیپ ٹاپ، چارجر، کتاب، پنسل اور تاروں کو کسی طرح لحاف کے اوپر ترتیب دینے کے بعد ہم طالب علم سے زیادہ ''کرسمس ٹری'' سے مشابہ ہوتے ہیں۔ فوراً ہمارے ذہن میں تاروں کے گنجھل ٹمٹماتی بتیوں کی طرح ابھرتے ہوئے ہمیں احساس دلاتے ہیں کہ جلد ہم بھی علم کے نور سے یوں ہی ٹمٹمارہے ہوں گے۔(علمی لوڈشیڈنگ البتہ پاکستان میں ناگزیر ہے۔)

بہر حال ہم لیپ ٹاپ کھول کے ابھی کتاب ہی کھول پاتے ہیں کہ ہمیں بازو پر کھجلی محسوس ہونے لگتی ہے۔ کپڑوں کی زیادتی کے باعث اس سے افاقہ نہ پانے پر ہم کچھ جدوجہد کے بعد ہلکا پھلکا ہونے پر سکون کا سانس لیتے ہیں۔ لیپ ٹاپ کی سکرین پر چمکتی سلائیڈز کو بسم اللہ پڑھ کر پڑھائی کا آغاز کرتے ہی ہیں کہ بہن کو اچانک امتحانی اٹیک کے Symptoms ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

''یار میرے اتنے چیپٹرز رہتے ہیں اور میرے پاس اتنے گھنٹے ہیں.... میں یہ سب کیسے کروں گی'' ان کی جذباتیت کے سامنے ہمارا دل پسیج جاتا ہے اور ہم پہلے انھیں ایک عدد ''موٹیویشنل لیکچر'' دیتے ہیں۔

لیں جناب واپس پڑھائی پر دھیان دیتے ہیں۔ دو سطور پڑھنے کے بعد ہمیں یاد آتا ہے ''یار امتحان میں ابھی بارہ گھنٹے پڑے ہیں اور میں نے صرف دو سیشنز کرنے ہیں تو کیوں نہ یوٹیوب پر کوئی کامیڈی دیکھ کر کچھ ریفریش ہو لیا جائے، بس دس منٹ کی ہی تو بات ہے''۔ پھر ہمارے دس منٹ ایک گھنٹے میں کیسے تبدیل ہو جاتے

ہیں اس کے بارے میں تحقیق جاری ہے کہ قصور یوٹیوب کا تھا یا پھر گھڑی کا۔ خیر کسی بھی صورت میں ہم تو رہے معصوم!!

موبائل ایک طرف رکھتے ہوئے پورے دھیان سے پانچ منٹ لیپ ٹاپ کی سکرین کو دیکھنے کے بعد ہمارے ذہن میں بجلی کا کوندا لپکتا ہے "یار ڈی پی تو بدلی ہی نہیں کافی عرصے سے" یہ چھوٹا سا کام کر لیں پھر پکا پڑھتے ہیں"۔ جناب آگے کی کہانی بہت سادہ ہے صرف ڈی پی کی تلاش میں جانے کیسے ایک گھنٹہ مزید سرک جاتا ہے۔ خیر ہمارے پڑھائی کرنے کے "جذبے" کو کوئی فرق نہیں پڑتا اور ہم پھر سے لیپ ٹاپ پر نظریں جما لیتے ہیں۔

اب کی بار ہمارا ذہن پورے دس منٹ بعد جاگتا ہے اور ہمیں خیال آتا ہے "یار ایک دوست کی شادی آرہی ہے کیا پہننا چاہیے؟" اس معاملے میں ہم بہن کے ساتھ انٹرنیٹ پر ڈریسز کے بارے طویل تحقیق کے بعد جب مطمئن سے واپس پلٹتے ہیں تو گھڑی کے خراب ہونے کا یقین ہو جاتا ہے۔

بہر حال ہم اتنے بزدل نہیں کہ اتنی سی چیز پر دل ہار دیں۔ ہم توبہ تائب کے بعد پھر سے پڑھائی کا آغاز کرتے ہیں اور یقین مانیں پورے بیس منٹ ادھر ادھر دیکھے بغیر خالصتاً ریڈنگ کرتے ہیں۔ عین اس وقت جب گھڑی بیسویں منٹ کو چھوتی ہے ہمیں احساس ہوتا ہے کہ لیکچر کی تو سمجھ ہی نہیں آرہی! یہ پہلا موقع ہوتا ہے جب ہمارا سٹریس لیول موٹیویشن سے آگے نکل جاتا ہے۔

اب کی بار بہن کے بھی کچھ ایسے ہی جذبات ہوتے ہیں "یار کتنے پیج رہتے ہیں؟ سونے کی امید ہے؟" جیسے کلمات پر ہم بڑے مطمئن سے بتاتے ہیں کہ ابھی بہت وقت پڑا ہے، یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔

ہم اس سب کے بعد جب واپس سکرین کو دیکھتے ہیں تو ایک اور پریشانی آن گھیرتی ہے کہ ہمیں یہ بھی یاد نہیں کہ کہاں تک پڑھ چکے! پھر ہم کچھ جدوجہد کے بعد اندازاً ایک سطر سے پڑھنا شروع کرتے ہیں تو کچھ دیر بعد یہ شبہ سر اٹھالیتا ہے کہ شاید یہ تو پڑھ لیا تھا! یعنی کچھ تو فائدہ ہو رہا ہے پڑھنے کا ...

جناب ایک گھنٹہ "پڑھائی" کرنے کے بعد اب ہمارا دل ہم سے کچھ انعام بھی چاہتا ہے۔ بھئی اتنا پڑھ لیا

ہے اب کچھ اچھا کھالینا چاہیے اور ہم تاروں کے گنجھل سے آزاد ہونے کے بعد کھانے کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ یہ دورہ قریباً ہر ایک آدھ گھنٹے بعد ضرور پڑتا ہے۔

یوں ہی ہمیں ہر آدھے گھنٹے بعد نیند کے دورے بھی پڑنے لگتے ہیں۔ بہن کے ہر دس منٹ بعد ''کتنا پڑھ لیا ہے'' کی یاددہانی اور سرکتے وقت کے ساتھ ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ آدھا وقت گزر چکا ہے اور ہمارے موٹیویشن اور سٹریس لیول کے روّیے بھی بدل چکے ہیں۔

لیکن ہماری ''جدوجہد'' قابل دید ہے کہ ہم پھر بھی اگلے روز پورے فخر سے آنکھوں میں آنسو لیے کہتے پائے جاتے ہیں ''یار اتنا پڑھا ہے پاس تو ہو ہی جائیں گے''۔

ہمارا ماننا ہے کہ یہ سب بھی کسی امتحانی سینڈروم کے Symptoms ہوں گے لہٰذا اگر آپ کے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہے تو یقین جانیے آپ بھی ہماری طرح بالکل ''معصوم'' ہیں۔ ناشکری کی بجائے امتحان پاس ہو جانے پر مٹھائیاں بانٹیں اور خود کو شاباشی سے محروم نہ رکھیں۔

عبداللہ محمود

قصور

''فیر! ویکھے نی کمشنر دے ٹوہر اَج؟'' کھوکھے کے باہر تھڑے پر لگی کرسیوں پر براجمان آصف اور ندیم بوتل پیتے ہوئے گفتگو کر رہے تھے۔

''آہو ویکھے نے یار۔ سیاست دان تے قسمے خدا دی ایویں بدنام نیں، اصل لُٹ مار تے ایہناں افسراں مچائی ہوئی اے۔ ملک دا بیڑہ غرق کرن وچ سارا قصور ایہناں دا اے۔'' ندیم ہاتھ اٹھا کر بولا۔

''آہ تے ہور کیہ! وزیرِ اعلیٰ توں ودھ پروٹوکول سی اوہدا۔'' آصف گالی دے کر بولا۔ ''اک فیتہ کٹنا سی تے سارے شہر نوں وخت پا چھڈیا سُو۔''

''دس توں ایہہ فیتہ گوجرانوالے ای بہہ کے کٹ لے۔ سرکار دا ایناں روپیہ برباد کیتا ای۔'' ندیم نے تبصرہ کیا اور ساتھ ہی خالی بوتل سڑک کنارے پھینک دی۔ ''چل یار چلیے ہُن۔ بھابھی تیری انتظار کر دی ہووے گی۔''

''چل!'' ندیم بھی اٹھ کھڑا ہوا اور دونوں ایک ساتھ قریب ہی واقع اپنے گھروں کی طرف چل دیے۔

''کیہ سوچیا اے توں ایس واری ووٹ کیہڑی پارٹی نوں دینا اے؟'' راستے میں ندیم نے پوچھا۔

''کھان کھسماں دا سر، میرے ولوں ساریاں پارٹیاں، ساڈا کیہڑا کجھ سنور جانا اے۔ توں اگر کہیں گا تاں دے دیاں گا کسے نوں ووٹ۔'' آصف نے اکتاہٹ بھرے لہجے میں جواب دیا تھا۔

''میرا کیہڑا مامے دا منڈا اکھلوتا اے۔ زبیر شاہ اِک واری آیا سی ساڈے گھر، تایا جی دے جنازے تے۔

سوچ رہیاں ساں اوہنوں ای دے دیاں ووٹ ایس واری۔'' ندیم سرسری انداز میں بولا، اور دونوں دوست الوداعیہ کلمات ادا کر کے اپنے اپنے گھروں کی جانب چل دیے۔

کمشنر ساجد بٹ چند بیوروکریٹس کے ہمراہ ایک نائٹ پارٹی میں شریک تھے۔

''بھئی پارٹیاں تو صرف ساجد صاحب کو Arrange کرنا آتی ہیں، ماننا پڑے گا۔'' ڈی سی عابد لطیف نے ابرو ستائش میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

''ساجد صاحب کی تو کیا ہی بات ہے۔ ہر جگہ آج کل یہی دکھائی دے رہے ہیں۔ کبھی سکولوں کے افتتاح میں تو کبھی فنڈ ریزنگ میں۔ ان کی پروموشن تو پکی سمجھیے۔'' کمشنر خالد اکمل وِسکی کا گھونٹ لیتے ہوئے بولے۔

''کیا فائدہ پروموشن کا خالد صاحب؟'' ساجد نے مسکراتے ہوئے اپنے لہجے میں افسردگی پیدا کی۔ گاڑیاں اور گارڈز دو چار اور مل جائیں گے، بس۔ مزہ تو سیاست دانوں کا ہے۔ اب وزیرِ اعلیٰ کو ہی دیکھ لیجیے۔ کروڑوں کی دہاڑیاں لگا رہے ہیں موصوف۔ اور اربوں کی ماریہ پرویز کو لگوا رہے ہیں۔ اور ہمارے ہاتھ باندھ رکھے ہیں۔''

''صحیح فرما رہے ہیں جناب۔ ہمارے حصّے تو ان کا بچا ہوا آتا ہے اور مفت کی بدنامی آتی ہے۔'' خالد نے لُقمہ دیا۔

''سنا ہے جس سکول کا آپ آج افتتاح کر کے آ رہے ہیں اس کا ٹھیکہ بھی ماریہ پرویز نے اپنے سمدھی کو دِلوایا ہے۔'' ڈی سی افتخار عالم نے سگار پیتے ہوئے اسٹیج پر موجود ڈانسر پر نگاہیں جماتے ہوئے گفتگو میں حصّہ لیا۔

''جی اور پندرہ فیصد کمیشن اپنی جیب میں ڈالا ہے۔ اسی لیے تو کہہ رہا تھا، اصل مزہ۔۔۔ میرا مطلب اصل قصور تو ان کا ہے۔'' ساجد بٹ جام مُنھ تک لے جاتے ہوئے بولے۔

''چھوڑیں انھیں ساجد صاحب۔ آپ یہ بتائیں آپ نے ماڈل زارا رؤف کے بارے میں سُنا ہے؟''

ایڈیشنل سیکرٹری جنگلات نعمان رضا نے مسکرا کر ترچھی نظروں سے خالد کو دیکھا تو سب نے ان کی نظروں کا تعاقب کیا اور چہکتے ہوئے داد دینے لگے۔

ماریہ پرویز نے عوامی پنڈال سجا رکھا تھا۔ انتخابات کی کمپین جاری تھی۔ عوام سے دھواں دار خطاب کے دوران اسٹیبلشمنٹ پر پھٹ پڑیں۔

"یہ تین سال کی نوکری والے آپ کے حق پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں۔ ملک کے اربوں انھوں نے بناڈکار کے ہضم کر لیے۔ اور اب۔۔۔ اب ان کے بڑے آپ کی محبوب پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی کو حکومت میں آنے سے روکنا چاہتے ہیں۔ سب نظر آرہا ہے۔ ہمارے کن لوگوں کو فون کالز آرہی ہیں اور انھیں اس خلائی مخلوق کی چہیتی پارٹی میں شامل کیا جارہا ہے۔۔۔ سب نظر آرہا ہے کون کون سے چہرے آج کل ٹی وی پہ کس کی زبان بول رہے ہیں۔ ملک کو تباہ کرنے میں۔۔۔ یاد رکھیے گا۔۔۔ ان کا اور محض ان کا قصور ہو گا۔"

نیوز چینلز کو "اوپر سے آنے والے" حکم پر جلسے کی نشریات درمیان میں ہی روکنا پڑی تھیں، اور پی ڈی پی کے جلسے لائیو نشر کرنے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔

"عثمان صاحب! اسٹیبلشمنٹ کی سیاست میں Involvement تو ایک Open Secret ہے لیکن اس کے باوجود ہم کبھی عوام میں اتنے Unpopular نہیں ہوئے جتنے اب جا رہے ہیں۔ چیف آف آئی ایس آئی رحیم احسان نے مسلح افواج کے بڑوں کی ایک بیٹھک میں چیف آف آرمی سٹاف کے سامنے تشویش کا اظہار کیا تھا۔

"جانتا ہوں رحیم احسان صاحب۔ عوام میں "فوج ملکی مفاد کے لیے Interfere کرتی ہے" کی بجائے "فوج ذاتی مفاد کے لیے Interfere کرتی ہے" کا بیانیہ زور پکڑنے لگا ہے۔ اس کا ایک فیکٹر تو ماریہ پرویز تھی جس کا بندوبست الیکشن میں ہم ویسے ہی کر دیں گے۔ اس کے علاوہ کیا وجہ سمجھتے ہیں آپ اس بیانیے کے عام ہونے کی؟" عثمان خالد نے رائے مانگی۔

"لبرل یونیورسٹیاں اور سوشل میڈیا سر!" لیفٹیننٹ جنرل نوفل فاروق نے لقمہ دیا۔

"یونیورسٹیز کو لگام ڈالنا مشکل نہیں، لیکن سوشل میڈیا کو کنٹرول کرنا کافی مشکل کام ہو گا۔" جنرل نیّر ربانی نے گویا کسی گہری سوچ سے بیدار ہو کر کہا۔

"یونیورسٹیز کا کام جنرل صاحب آپ کے ذمے۔ اس کے علاوہ ایک ڈرامہ آئی ایس آئی کے ذریعے پروڈیوس کروائیں۔ ذرا Strong Nationalistic Content کے ساتھ۔" عثمان خالد نے حکم صادر کیا۔ جس پر نیّر ربانی نے لبیک کہا۔

"سر سوشل میڈیا نہ سہی لیکن میڈیا کو تو کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی میں تو سمجھتا ہوں سارا قصور انھی کا ہے، چند پیسوں کے عوض کسی بھی اندرونی یا بیرونی سازش گر کا منجن بیچنے لگتے ہیں اور قوم کو غلط سمت میں لگا دیتے ہیں۔" رحیم احسان نے اپنے مطابق قصوروار کی نشان دہی کی۔

"بجا فرما رہے ہیں آپ رحیم صاحب۔ بس پھر میڈیا میں چند نئے سپوکس پرسن ڈھونڈیں اور Pemra کو ذرا Active کریں۔" عثمان خالد نے آخری حکم صادر کیا۔ جس پر رحیم احسان نے "Yes Sir!" کہہ کر اسے بجالانے کی حامی بھری۔ حکمتِ عملی طے ہو گئی تو چائے کا دور چلنے لگا۔

عائشہ زیدی ایک مشہور چینل کے پرائم ٹائم پر اپنا شو براہِ راست کر رہی تھیں۔ ان کے شو میں تین مشہور تجزیہ کار نازش قمر، ثنا بخاری اور ارشد محمود بہ طورِ مہمان موجود تھے۔

"ارشد صاحب! ابھی حال ہی میں ماریہ پرویز نے ایک تقریر کی تھی اپنی کمپین کے دوران جس کے بعد ان کے جلسے ہمیں لائیو دکھانے سے روک دیا گیا ہے۔ کیا کہیں گے آپ اس بارے میں؟" عائشہ نے سوال کیا۔

"ظاہر سی بات ہے عائشہ کہ۔۔۔ جب آپ اُس قوّت کا نام لے کر کہیں گے کہ وہ اس ساری خرابی کی ذمہ دار ہے تو پھر آپ کی تقاریر توہین ہوں گی ہی۔"

ارشد کے جواب پر نازش ہنسنے لگیں اور بولیں: "ارشد صاحب آپ کا بھی لگتا ہے بَین ہونے کا ارادہ

ہے۔" عائشہ بھی ہنس دیں۔

"اچھا چلیں یہ بتایے گا ارشد صاحب کیا آپ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں جو ماریہ نے جلسے میں کی تھی؟" اگلا سوال کیا گیا۔

"بالکل سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔" ارشد کے جواب پر ثنا نے نازش کے قریب سرگوشی کی۔

"لگتا ہے دوسری سائیڈ سے ڈیل ہو گئی ہے ارشد محمود کی۔" خوش قسمتی سے یہ سرگوشی مائیک کی زد سے بچ گئی۔ البتہ نازش ہلکا سا ہنس دیں۔

"اچھا ثنا! آپ بتایے گا آپ کے خیال میں ملک کی تباہی کا ذمہ دار کون ہے؟" عائشہ نے اگلے سوال کے لیے ثنا سے رجوع کیا۔

"دیکھیں میں تو سمجھتی ہوں سارا قصور عوام کا ہے۔ جیسی عوام، ویسے حکمران۔ وہ حکمران خواہ پھر کسی بھی صورت میں ہوں جب عوام کو اپنے حقوق کا پتہ ہے نہ فرائض کا، تو ظاہر ہے پھر ملک اسی لوپ میں پھنسا رہے گا اور حالات خراب سے خراب تر ہوتے جائیں گے۔" ثنا کے جواب کے بعد پروگرام کسی اور بحث کی طرف چلا گیا اور ثنا کے تبصرے سے متعلق مثبت و منفی ٹرینڈز Twitter پر سامنے آنے لگے۔

صدف یاسمین

میرے بچپن کے دن

جب آپ خاندان سے دور رہتے ہوں اور کسی خاندانی فنکشن میں شرکت کریں تو منظر کچھ یوں ہوتا ہے:

سورج طلوع ہوتے ہی سارے گھر میں لوگوں کی ''چہچہاہٹ'' گونج اٹھی۔ ہمارے کمرے میں عوام یوں اندر باہر ہونا شروع ہو گئی جیسے ہم اپنے کمرے میں نہیں سٹیشن کے بینچ پر سو رہے ہوں۔ ہم خود کو لحاف میں مکمل طور پر چھپانے کی کوشش کرنے لگے کہ کوئی ہمیں دیکھ نہ لے اور عین اسی وقت کوئی بچہ گزرتے گزرتے ہمارے لحاف کا کونا اٹھا کر جھانک کر بولا ''سُتے پئے او؟'' اور ہم لب بھینچ کے رہ گئے۔ کہیں سے کانوں میں فقرہ پڑا ''ہاہائے سارا ملکھ (ملک) جاگدا پیا اے، پر ایہہ لہور آلیاں دی سویر ای نہیں ہوئی'' تو ہم ہڑبڑا کے یوں اٹھ بیٹھے جیسے کسی نے کان میں ''واجا'' بجایا ہو۔ اپنی بگڑی حالت پر منہ کو کپڑے میں لپیٹتے، ہاتھ میں ٹوتھ برش پکڑے، چھپتے چھپاتے جو ہم واش روم کی جانب گامزن ہوئے تو کسی ماں جی کا فقرہ کانوں میں گونجا ''ایہہ آصف دی نکی اے؟ ہا، نکی ساری ہوندی سی جدن میں آخری واری ویکھیا ہائی'' اور ہم حتی الامکان ''کچھ بھی نہ سننے'' جیسے تاثرات چہرے پر جمائے رفتار بڑھاتے ہوئے ان کے پہلو سے گزر ہی رہے تھے کہ ماں جی نے ہمارا بازو پکڑ کر روک لیا۔ ''بچیا اسی وی دہاڈیاں ماواں ای آں تے نکیاں ہوندیاں تن اساں ای چایا اے'' کہتے ہوئے وہ ہماری زبردستی کی مسکراہٹ کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے سب سے پہلے نظروں سے ہمارا ایکسرے کرنے لگیں۔ ''ہلا سارے آئے او؟'' اور ہم نے عاجزی سے نگاہیں حتی الامکان جھکائے سر ہلا دیا۔ دوسری ماں جی بھی بولنے لگیں ''نی شاہدہ ویکھ کڈی وڈی ہو گئی اے! لے آمنہ تن کھان نوں کجھ نہیں دیندی شوہدی دی حالت تے

ویکھو"۔ ابھی ہم جان چھڑانے کی ترکیبیں ہی سوچ رہے تھے کہ قریب کی چارپائی سے دو تین خواتین متوجہ ہوئیں "نی ایدے وی مل لے کڑیے!" اور ہم پہلی ٹیم سے چھٹکارا ملنے پر خوش ہوتے ہوئے ان کی جانب بڑھ گئے "ہلا فر کیویں پڑھدی ایں؟" ایک خاتون نے چوکڑی مار کے ہاتھ پر گال جما کے ہم سے پہلا سوال کیا "جی بی ایس کر رہی ہوں" کے شرمیلے سے جواب پر اب ایک نیا موضوع کھل گیا اور پھر ہمارا بی ایس بی اے میں کب تبدیل ہوا اس کا اندازہ ہمیں بھی نہیں ہوا!

"ہلا من سولا پڑھ کے ای واپس اونا اے! میرا پتر وی سولاں کر کے ہن افسر لگیا اے!"

"آ ایہہ بی اے نال ہن کجھ نہیں بندا میرا پتر! تُوں سولاں ضرور کرنیاں نے پتا تے لگے فر لہور پڑھدے او"

منظر کچھ یوں تھا جیسے چھوٹے بچوں نے کوئی رنگ برنگا چھوٹا سا جانور دیکھ لیا ہو اور اب وہ اسے ہر جانب سے فوٹو شوٹ کر رہے ہوں۔ بہر حال اس سارے سے تنگ آ کر ہم نے ہاتھ میں پکڑا ٹوتھ برش گھماتے ہوئے ادھر ادھر کا نظروں سے طواف کیا تو کسی ایک دانشمند ماں جی کو سمجھ آ گئی اور ہماری شفٹ ختم ہوئی! بعد میں والدہ سے پوچھ گچھ پر معلوم ہوتا ہے کہ "موصوفائیں" ان کی خالہ کی محلے والی تھیں اور ہمارے بچپن میں ایک ملاقات میں انھوں نے ہمیں اچھا خاصا "پال" لیا تھا۔

بھئی جو بھی ہو ہماری صرف اتنی سی درخواست ہے کہ بندے کو منہ تو دھونے دیا جائے۔

ضیغم علی

کس نے کہا تھا؟

صبح کے نو بجے ہیں، اختر صاحب بر آمدے میں بیٹھے روزانہ کی طرح اخبار کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اخبار میں خبر چھپی ہے: ''پچیس سالہ ثانیہ جو کہ ایک جرنلسٹ تھی، ایک خوف ناک حادثے میں انتقال کر چکی ہے۔ اخبار میں یہ بھی لکھا ہے کہ ثانیہ اپنے گھر کی بڑی بیٹی تھی اور اپنے والد کے انتقال کے بعد پچھلے سات سال سے گھر کو چلا رہی تھی۔ ثانیہ کے تین چھوٹے بہن بھائی بھی ہیں اور ایک بوڑھی ماں ہے جن کا اب کوئی اور سہارا نہیں۔ ثانیہ کا انتقال۔۔۔ باقی صفحہ نمبر ۸''

اختر صاحب ایک لمحے کیلئے افسردہ ہوئے اور پھر دوسری خبروں پر نظریں دوڑانے لگے۔ یہاں اختر صاحب جو پیشے کے لحاظ سے ایک وکیل ہیں، اپنی چائے کے ساتھ اخبار پڑھ رہے ہیں اور دوسری طرف ثانیہ کی والدہ رضیہ بی بی ابھی تک اس حقیقت پر یقین نہیں کر سکی کہ اس کی بیٹی اب نہیں رہی۔ رضیہ بی بی کے گھر میں سوگ کا عالم ہے، محلے دار اپنے وقت کے حساب سے باری باری آکر مرحومہ کے حق میں دعا کر رہے ہیں اور جس سے جتنا ہو سکا، گھر والوں کی مدد کر رہا ہے۔ محلے کی کچھ بوڑھی عورتیں قرآن خوانی اور تسبیح میں مشغول ہیں۔

ضامن جس کی پندرھویں سالگرہ ابھی پچھلے ہی مہینے گزری تھی، اپنی آپی کے کمرے سے اپنی والدہ کی شوگر کی دوائی تلاش کر رہا ہے۔ کمرے کے داخلی دروازے کی سامنے والی دیوار پر بنے ہوئے لکڑی کے شیلف پر ثانیہ کے تمام نصابی اور غیر نصابی ایوارڈ اور انعامات پڑے ہوئے ہیں۔ ان انعامات کے درمیان ثانیہ کی فریم شدہ گریجویشن کی فوٹو بھی موجود ہے جس میں وہ اپنی ڈگری ہاتھ میں لیے ایک تسلی بخش مسکان کے ساتھ اپنے کنبے کے سنگ کھڑی ہے۔ تصویر کی بائیں جانب ثانیہ کے نام کا آل پاکستان ڈیبیٹ مقابلے کا پہلا انعام رکھا ہوا ہے اور تصویر کی دائیں جانب

چار سالہ صحافت کی ڈگری ایک خوب صورت فریم میں آویزاں ہے۔ ان مرکزی چیزوں کے ارد گرد اسکول اور کالج کے باقی انعامات بھی سجے ہوئے ہیں۔ شیلف کے دوسرے خانے میں، بہت سی کتابیں پڑی ہیں۔ ان کتابوں میں کچھ رنگین کتابیں بھی ہیں جو دراصل چند ڈائریاں ہیں جن میں ثانیہ نے اپنی زندگی کے شب و روز درج کیے ہیں۔

یہ ڈائریاں ثانیہ نے اپنے دور طالب علمی میں لکھنا شروع کی تھیں۔ ضامن رنگین کتابوں کی طرف بڑھا اور گلابی رنگ کی سب سے چھوٹی ڈائری ان کتابوں سے نکال لی، ڈائری کے پہلے صفحے پر وہ تاریخ لکھی گئی تھی جس تاریخ کو اس ڈائری کا آغاز ہوا۔ ثانیہ کی ڈائری عموماً دو سے تین سال چلتی تھی کیوں کہ وہ روزانہ ڈائری لکھنے کی عادی نہیں تھی۔ اس لیے ڈائری کے اختتام پر وہ تاریخ لکھی تھی جس تاریخ کو وہ ڈائری ختم ہوئی۔ ضامن نے اس ڈائری کو پڑھنے کی نیت سے کھولا۔ ڈائری کے دوسرے صفحہ پر انگریزی میں لکھا تھا" My New Year Goals"۔ مجھے اس سال کلاس میں اول آنا ہے۔ مجھے اپنی جسمانی اور دماغی صحت کا خیال رکھنا ہے۔ مجھے پاکستان کی سب سے اچھی یونیورسٹی میں داخلہ لینا ہے۔ مجھے اپنی والدہ سے ساری سلائی کڑھائی سیکھنی ہے۔ مجھے محلے کے سارے بچوں کو گھر پر پڑھانا ہے اور گھر کی مالی مدد کرنا ہے۔ مجھے ضامن اور صائمہ کے لیے ایک کمپیوٹر بھی خریدنا ہے۔ ان تمام گولز کو ثانیہ نے مختلف خوب صورت رنگوں کی روشنائی سے لکھا ہوا تھا اور سنہرے رنگ کے مارکر سے ان کے گرد پھول بنائے ہوئے تھے۔ ایک ایک صفحہ پڑھنے کی بجائے ضامن پوری ڈائری ٹٹولنے لگا۔

اس کی نظر لال مارکر سے لکھے ہوئے بڑے بڑے لفظوں پر پڑی۔"Goal Achieved"۔ وہ اس صفحہ پر رُک گیا۔ یہاں ثانیہ نے لکھا تھا، یہ میری زندگی کا شاید سب سے اہم دن ہے۔ آج کلاس کے نتیجہ میں مَیں اول آئی ہوں۔ یہ نتیجہ جب محلے داروں کو معلوم ہوا تو آنٹی رخسانہ اور آنٹی شہناز، امی کو مبارک دینے آئیں اور ساتھ ہی یہ درخواست کر گئی ہیں کہ آج سے میں ان کی دونوں بیٹیوں کو ہر شام دو گھنٹے کے لئے سبق یاد کراؤں۔ میں نے تو امی سے کہہ دیا ہے کہ اس سے جو بھی رقم حاصل ہو وہ مجھے نہیں چاہیے، آپ اسے گھر کے خرچوں میں استعمال کر لیجئے گا۔ امی نے مجھے بہت پیار کیا اور شاید ابو کو یاد کر کے وہ رونے لگیں۔ میں امی کو کہنا چاہتی تھی، کہ وہ پریشان نہ ہوں، میں سب ٹھیک کر دوں گی۔ اب بس کچھ اور بچے مل جائیں جن کو پڑھانے سے کچھ اور رقم آجائے تو میں صائمہ اور ضامن کی

کمپیوٹر کی ضد بھی پوری کر دوں۔ اے ڈائری، میری دوست، تُو تو جانتی ہے کہ میں ان دونوں سے کتنی محبت کرتی ہوں۔

یہ سب پڑھ کر ضامن خود کو بہت دل برداشتہ محسوس کر رہا تھا، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کوئی ایسا معجزہ ہو، وہ اپنی آپی سے ملے اور اپنی محبت کا اظہار کر سکے۔ اس نے اس ڈائری کو بند کر دیا اور شیلف پر اپنی جگہ واپس رکھ دیا۔ ڈائریوں کی اس قطار کے آخر میں ثانیہ کو اس کی کمپنی کی طرف سے دی ہوئی ڈائری موجود تھی۔ ضامن نے اس ڈائری کو اٹھایا۔ پہلے کی طرح تاریخ کے بعد اس ڈائری کے دوسرے صفحہ پر اس سال کے مقاصد لکھے ہوئے تھے۔ ثانیہ کے مقاصد اب پہلے کی طرح چھوٹے چھوٹے نہ تھے۔ ان مقاصد میں ایک پختہ سوچ اور ارادہ نظر آ رہا تھا۔ ثانیہ کو ملک کے بڑے نیوز چینلز کے لیے کام کرنے کا شوق تھا۔ ان مقاصد میں تین بڑے نیوز چینلز کے نام درج تھے۔ مجھے یہاں تک پہنچنے کے لئے اس سال ملک کے تمام بڑے واقعات کی کوریج کرنی ہے۔ نیوز چینلز والے گول کے ساتھ، یہ تحریر لکھی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ثانیہ اپنی والدہ کو عمرہ کرنے کے لیے بھیجنا چاہتی تھی۔ یہ تمام مقاصد انگریزی میں لکھے گئے تھے۔ آخری گول میں لکھا تھا کہ رشتے داروں کے قرضے جیسے ہی ختم ہوں تو میں نے گاڑی خریدنے کی سکیم میں حصہ لینا ہے اور ضامن کو موٹر سائیکل چلانا سکھانا ہے۔ لکڑی کی اس شیلف کے نیچے ہی میز پر مرحومہ کے موٹر سائیکل کی چابی اور لال ہیلمٹ پڑا ہوا تھا۔ جوں ہی ضامن کی نظر اس میز پر پڑتی ہے، اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں اور اس کی نظر دھندلا جاتی ہے۔ اس کے ذہن میں اپنی چہیتی بہن کی یادیں امنڈ آتی ہیں اور وہ اپنے آنسو نہ روک سکنے کے باعث دوبارہ رونے لگتا ہے۔ اتنے میں صائمہ ضامن کو امی کی دوائیاں لانے کے لئے آواز دیتی ہے۔ ضامن ڈائری کو اپنی جگہ واپس رکھتا ہے اور دوائیوں کا ڈبہ ٹٹولنے لگتا ہے۔

ادھر اختر صاحب ملک کی باقی بڑی اور پریشان کن خبروں سے فارغ ہو کر صفحہ نمبر ۸ پر آتے ہیں اور باقی کا قصہ معلوم کرتے ہیں۔ پتہ چلتا ہے کہ ''ثانیہ کا انتقال ایک مشہور سیاسی لیڈر کے چلتے ہوئے کنٹینر کے نیچے آنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ ثانیہ اس سیاسی لیڈر کا انٹرویو لینا چاہتی تھی، جس کی وجہ سے وہ چلتے ہوئے کنٹینر کے ساتھ ساتھ بھاگ رہی تھی، اور بدقسمتی سے اس کی زد میں آ گئی''۔ اختر صاحب نے اخبار رکھتے ہوئے دھیمے سے یہ فقرہ بڑبڑایا، ''کس نے کہا تھا ٹرک کے ساتھ بھاگے؟''۔

ایمن فاطمہ

میری ڈائری کے اوراق

۱۹ اگست ۲۰۲۱ء، جمعرات کا دن

میری زندگی کی کتاب کا ایک صفحہ آج کا دن۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ انسان اس وقت کے سمندر میں تیر سکتا ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں اور وقت بڑا ظالم ہے یہ کسی کے لیے نہیں رکتا۔ لیکن ہم کبھی نہیں بدلتے۔ ہمیشہ آج کی بات کل پر ڈالتے ہیں۔ اور وقت گُزرتا ہے تو پتہ بھی نہیں چلتا۔

بہ قول ابراہیم ذوقؔ:

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی ایک اور گھٹا دی

ویسے تو آج کچھ بھی نہیں کیا، معمولی سی روٹین تھی لیکن شاید میں نے آج ایک سال کا سفر کیا اور اپنی زندگی کی خوب صورت یادوں میں ڈوب گئی۔ میری زندگی کے سات سالوں کی یاد ہے جو میں نے چھٹی جماعت سے بارھویں جماعت تک کے سفر میں گزارے۔

ویسے ہمیں وہاں بھی ایڈمن سے کافی شکایات ہوا کرتی تھیں، کچھ اسی طرح کی یہاں بھی لوگوں کو ہیں۔ لیکن جو سات سال میں نے وہاں گزارے ہیں، اُن کے مقابلے میں مجھے یہ شکایات بے بنیاد لگتی ہیں۔ جو کرفیو اب کرونا کی وجہ سے لمز پر لگا ہے وہ کچھ بھی نہیں لگتا کیوں کہ اُس وقت ہم سارا وقت اندر ہاسٹل کی بلڈنگ میں گُزار دیتے تھے۔ ہماری ساری دنیا وہی ہوتی تھی۔ ہمیں باہر نکلنے کی اجازت بالکل بھی نہیں ہوا کرتی تھی۔ مین دروازے پر ایک بڑا سا تالا اور ایک لیڈی گارڈ بیٹھی رہتی تھیں۔ یہاں تو ہم ساری یونیورسٹی گھوم سکتے ہیں اور سب سے بڑھ

کر باہر سے آرڈر کر واسکتے ہیں اور رات کے نو بجے تک واپس آسکتے ہیں۔ دوسرا یہاں پر میرے پاس موبائل فون ہوتا ہے چوبیس گھنٹے، وہاں ایسی کوئی سہولت استعمال نہیں کرنی ہوتی تھی۔ وائرلیس پر کال ہوتی تھی دو منٹ کی، اور وہ بھی گھر والوں نے کال اٹھائی تو، ورنہ وہ بھی نہ ہوتی تھی۔ والدین ہم سے صرف اور صرف اتوار کے دن ملنے آتے تھے باقی دنوں اجازت نہ تھی۔ پھر آخر میں ہمیں مہینے کے صرف دو ہفتے ملنے کی اجازت دی گئی تھی۔ پھر میں بھی ایسے ماحول کی عادت ڈال چکی تھی۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو گھر والوں کو بلا لیا ورنہ نہیں۔ ہم کمرے میں آٹھ لوگ رہتے تھے اور چھے الماریاں ہوتی تھیں اور لمز میں جب سے دو کی بجائے تین لوگوں کا کہا گیا ہے، سب کو فرق پڑ رہا ہے مجھے تو یہ کچھ بھی نہیں لگ رہا۔ ہمارے کمرے کی کھڑکی تھوڑی چہل پہل والی روڈ کی طرف کھلتی تھی۔ (ویسے اتنا نہیں کہہ سکتے، ویران ہی ہوتی تھی۔ یہ اتوار کے دن کی چہل پہل کی بات ہو رہی ہے) تو ہم پرچی پر سامان لکھ کر روپے ساتھ ڈال کر وہاں سے گُزرتی کسی بھی لڑکی کو بلاتے تھے اور وہ ہمارے لیے چیز لے آتی۔ کیوں کہ ہم سب روم میٹس کو گھر والے ملنے نہیں آتے تھے۔ سب کافی دُور سے تھیں، بلوچستان وغیرہ سے۔

ہمیں ہفتے کے ایک دن پلاؤ ملتا تھا۔ دوپہر کے وقت اور شام میں دال ہوا کرتی تھی تو وہ ہم اپنے ڈبوں میں بھر کر رات کے کھانے کا انتظام کیا کرتے تھے۔ حالاں کہ ہمیں اس چیز کی اجازت نہیں تھی لیکن پھر بھی ایسا کرتے تھے۔ اب چاہے جیسے بھی رہیں لیکن اُس وقت کی بہت یاد آتی ہے جب وہاں ہوتے تھے تو دل کرتا تھا وقت بہت جلدی سے گُزر جائے اور یہاں سے نکل جائیں لیکن وقت ایسے گُزر رہا ہے جیسے ہاتھ سے ریت پھسلتی ہے اور دوبارہ سے نہیں آتی۔ اسی طرح سے سمندر کے کنارے سے ایک لہر آکر ٹکراتی ہے تو دوبارہ کبھی وہ لہر نہیں ٹکراتی۔ اسی طرح سے زندگی کا لمحہ جو ایک بار گُزر جاتا ہے دوبارہ نہیں آتا۔ یادیں دراصل وہ لمحہ ہوتی ہیں جنھیں ہم پوری طرح جیتے ہیں۔

اے بچپن بتا تُو کہاں کھو گیا ہے
یا کہہ دے تُو اب "بڑا" ہو گیا ہے

---

۲۰ اگست ۲۰۲۱ء، جمعہ کا دن

آج کے دن کا آغاز بھی معمول کی طرح ہی تھا۔ لیکن آج گھر کا سفر کرنا تھا۔ یہ فیصلہ میں نے کل اچانک کیا، کیوں کہ میں اکیلی لاہور سے ڈیرہ غازی خان نہیں آنا چاہتی تھی۔ لیکچر بھی لینا تھا اور وقت پر ٹرمینل بھی پہنچنا تھا۔ میں نے ساتھ ساتھ لیکچر کا بھی کام کیا اور جو سامان باقی رہ گیا تھا، اس کی پیکنگ کرنا شروع کر دی۔ ویسے آج کے دن بہت کچھ ہونے والا تھا، معلوم نہیں تھا۔ عائشہ نے اپنے گھر والوں سے کہا تھا کہ وہ لینے آئیں اور عائشہ ایک بجے چلی جائے گی لیکن میرا تو لیکچر ہی ایک بجے ختم ہونا تھا تو میں چار بجے والی گاڑی سے جانا چاہ رہی تھی کہ آرام سے چیک آؤٹ کروں گی اور پھر اطمینان سے سفر ہو جائے گا اور چار بجے پہنچ جائیں گے۔ پہلے میں نے ٹکٹ کرانے کے لیے بلال ٹریولز کو کال کی ان کی آخری بس ایک بج کر بیس منٹ پر روانہ ہونا تھی لیکن میں نے کال کرنے میں دیر کر دی۔ پھر دوسری بس سروس پر کال کی اور چار بج کر تیس منٹ کی ٹکٹ بک کروائی، پھر تین بجے تک اُٹھے سب کچھ سیٹ کیا، کارٹن سیل کیے اور ہاسٹل وارڈن سے بات کی اور چیک آؤٹ کرایا۔ لیکن اُسی میں ہمیں دیر ہو گئی اور موسم بھی بہت خراب ہونے لگا اور اچانک ہی بہت تیز بارش ہونے لگی۔ شکر ہے یونیورسٹی والوں نے کار ڈرائیور کو اندر آنے دیا۔ اس کی بھی ایک الگ کہانی ہے۔ راستے میں گارڈ کو بُرا لگا کہ لڑکیاں بارش میں بھیگ کر مین دروازے پر جائیں۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ میرا نام نہ لینا لیکن وہاں جو وائرلیس رکھا تھا اُسی سے نمبر بتایا اور کہا کہ تمھارے ڈرائیور کو اندر آنے دیں۔ لیکن ہر جگہ کے اپنے قاعدے قانون ہوتے ہیں۔ گیٹ والوں نے وارڈن سے کہا کہ کال کرے، پھر انھیں ای میل کی اور کام ہو گیا۔ بارش کی وجہ سے ہمیں کافی دیر ہو گئی اور ہم ٹرمینل پہ کافی دیر سے پہنچے۔ وہ بس بھی جا چکی تھی۔ پھر ہم نے دوسری بس کا پوچھا تو وہ کافی دیر بعد روانہ ہونا تھی، جس وقت تک ہم نے گھر بھی پہنچ جانا تھا۔ پھر ہم نے ملتان کی ٹکٹ خرید لی وہ بس اُسی وقت روانہ ہو رہی تھی۔ شکر ہے کہ سفر خیریت سے گزرا۔ لیکن ہمارے پاس ملتان سے ڈی جی خان جانے کے پورے پیسے نہیں تھے۔ گھر والوں سے اے ٹی ایم میں ڈلوانے کا کہا، لیکن اُترنے پر معلوم ہوا کہ وہاں پر کوئی مشین نہ تھی۔ اور ہمارے شہر تک اس ٹرمینل کی کوئی بھی گاڑی نہیں جا رہی تھی۔ خدا کا کرم تھا، مہربانی تھی یا معجزہ، کہ ایک سڑک

کے پار اے ٹی ایم مشین بھی موجود تھی اور دوسرا ٹرمینل بھی۔ وہاں پر گاڑی تیار تھی۔ دس بج کر پندرہ منٹ پر ٹکٹ کروائی اور دس بج کر بیس منٹ پر گاڑی نے روانہ ہونا تھا۔ پھر وہاں سے خدا کے فضل و کرم سے پہنچ گئے میرے گھر۔ وہاں میری سب سے چھوٹی بہن سب سے زیادہ بے صبر تھی۔ وہ روزانہ نو بجے سو جاتی تھی اور آج میں رات کے بارہ بجے پہنچی اور وہ ایسے چہک رہی تھی جیسے دن کے بارہ بجے ہوں۔ اور ایسے ہی میرے سفر کا اختتام ہوا اور اب میں بہت تھک چکی ہوں اور اب سونے چلی ہوں۔

---

۲۱ اگست ۲۰۲۱ء، ہفتہ کا دن

ازل سے چلتی اس دنیا میں چلتے ہوئے لوگ۔ آتے جاتے موسم اور ان سب کے درمیان میری دنیا چھوٹی سی، لیکن اس کے واقعات اتنے ہیں کہ اگر نیلی سیاہی سے ان صفحوں کو نہلا دوں تو شاید ایک دو باتیں پھر بھی رہ جائیں۔ ہر دن اپنے ساتھ اک نیا واقعہ ایک نیا آغاز لے کر آتا ہے۔ میرا بھی آج کا دن کچھ ایسا ہی تھا۔ ویسے کبھی کبھی کچھ لمحات ایسے ہوتے ہیں کہ دل کرتا ہے وقت یہیں رُک جائے لیکن وقت کو بھی ضد ہوتی ہے اُس لمحے سے، جلدی جلدی گُزرنا شروع ہو جاتا ہے۔ آج کے دن میں نے بھی کچھ خاص نہیں کیا بس نیٹ فلکس کی عادت ختم نہیں ہوتی۔ ایک فلم دیکھی اور پھر مجھے اُردو ناولز پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ ویسے ایک زمانے میں مَیں ایک صفحہ پڑھنے سے بھی کتراتی تھی ۔ پھر یہ آغاز نہم جماعت میں ناول سننے سے ہوا جس کا نام جنّت کے پتّے تھا۔ لڑکی یعنی کبریٰ نے آدھا سُنایا اور آدھے پہ اُسے ضد آن پڑی کہ اب میں تھک چکی ہوں۔ اُس کے بعد تجسّس میرا پیچھا نہ چھوڑتا تھا کہ اب آگے کیا ہوا ہو گا اور پھر کیا ہوا ہو گا۔ پڑھنا پڑا۔ وقت تو بہت لگا لیکن وہیں سے پڑھنا شروع کیا اور آج تک عادت ختم نہ ہوئی۔ بہت زیادہ عادت ہو چکی تھی۔ میں ہمیشہ سکول کی لائبریری میں ہی نظر آتی تھی اور ایک استاد نے اتنا تک کہہ دیا کہ ”تم ایک کام کرنا، اپنا مقبرہ بھی لائبریری میں ہی بنوا لینا“۔ کبھی کلاس میں دیر سے داخل ہوں تو ہمیشہ یہی کہتی کہ لائبریری سے آ رہی ہوں اور میں کہتی کہ نہیں کسی اور کام سے نکلی ہوں۔ آج کل ہاشم ندیم کا ناول عبداللّٰہ پڑھ رہی ہوں۔ مجھے کافی پسند ہے۔ میں کافی دنوں سے

آرڈر کا انتظار کر رہی تھی، میں نے میک اَپ منگوایا تھا۔ شکر ہے سب کچھ ٹھیک حالت میں گھر پہنچا۔ شام میں ابا جان نے موٹر سائیکل بنوانے جانا تھا۔ پھر واپسی پر پھوپھو جان کو لیتے آئے۔ پھر پھوپھو جان کے ساتھ بیٹھ گئے میرے رزلٹ کے بارے میں پوچھنے کے لیے۔ پھوپھو .G.P.A پوچھیں اور میں بتاؤں نا۔ پھر کسی طرح جان چھڑا کے میں دوسرے کمرے میں آکر بیٹھ گئی۔ بہ قول شکیل عظمیٰ:

برت رہا ہوں لفظوں کو اختصار کے ساتھ
زیادہ لکھنا ہے اور ڈائری بہت کم ہے

انسان کو بالکل سمجھ نہیں آتا کہ وقت کے اِس بہتے سمندر کو کیسے روکے۔ کس طرح سے اس کے سامنے آکر ٹھہرے اور اپنے سب سے حسین لمحے کو وہیں منجمد کر لے۔

کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ بس ہم موت کی طرف بھاگتے جا رہے ہیں اور ہم کچھ بھی نہیں کر رہے۔ بس سوتے اور جاگتے رہتے ہیں۔ ان سب چیزوں میں آج ایک بہت بُرا احساس ہوا۔ ہمیشہ سے میں ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ ہمیشہ اعلیٰ نمبروں سے کامیابی حاصل کی جس کی وجہ سے مجھ سے وابستہ لوگوں کی اُمیدیں مجھ سے بڑھ گئیں لیکن کرونا کی وجہ سے مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت ہوئی اور میں اپنا ڈاکٹری کا امتحان پاس نہ کر سکی، لیکن میرا داخلہ LUMS میں ہو گیا۔ جو بھی ہوتا ہے اچھا ہی ہوتا ہے لیکن ہمیشہ جب کبھی بھی ڈاکٹری سے متعلق کوئی بات ہوتی ہے تو مجھ پر ایک تازیانہ رسید کیا جاتا ہے۔ شاید وقت کے ساتھ سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔

ہے اس میں طولِ شامِ غم کا قصّہ
جو یہ بالشت بھر کی ڈائری ہے

(نیلم ملک)

راز احتشام

غزل

مجھ سے نفرت کرتے کرتے تُو بھی مجھ سا ہو گیا
شکریہ اے شخص! میرا بوجھ ہلکا ہو گیا

چند ہی رعنائیاں ہیں اس جہانِ خاک میں
دل ہوا، دریا ہوا یا اس کا چہرہ ہو گیا

کیا عجب تدبیر سے روکا ہے اس نے میرا وار
میں نے جب تلوار اٹھائی، وہ نہتّا ہو گیا!!

عشق وہ سرکس ہے اے نوواردانِ شہرِ دل!
"جو تماشا کرنے آیا خود تماشا ہو گیا"

وہ گیا تو بڑھ گئی اس کی طلب راز احتشام
سوکھ جانے پر یہ دریا اور گہرا ہو گیا

رازاحتشام

غزل

ہم اندھے لوگوں کو آئینہ خانہ لے آئے
اور ایسا وقت کسی پر خدا نہ لے آئے

اسے یہ خوف کہ مل کر ہوا نہ ہو جاؤں
مجھے یہ ڈر ہے کہیں وہ دیا نہ لے آئے

ترے پلٹنے کی یوں تو کوئی سبیل نہیں
خدا کرے کہ تجھے آب و دانہ لے آئے

کبھی کبھی تو بہانہ بھی لُطف دیتا ہے
مگر جو روز ہی تازہ بہانہ لے آئے

عجیب خشک طبیعت کے لوگ تھے پھر بھی
تمہارا ذکر بہت شاعرانہ لے آئے

نبھا رہا ہے وہ جس طور اپنی پیشہ وری
ہماری موت پہ بھی کیمرا نہ لے آئے

نائلہ عابد

غزل

مفلسی کا دور ہے، فاقہ کشی کا زور ہے اب
ہے حقیقت کیا بشر کی، ظالمانہ دور ہے اب

چھا رہے ہیں موت کے سائے ہماری ذات پر یوں
دل دھڑکتا ہے مگر اک پُرسکوں سا شور ہے اب

پھر صدارت کے نشے میں کھیل کھیلیں گے مداری
بے حِسّوں کے ہاتھ میں ہم بے کسوں کی ڈور ہے اب

راج کرتا ہے جو اس سے کیا کریں کوئی گزارش
کیا نبھائے گا فرائض حکمراں، کمزور ہے اب

ہے کٹہرے میں کھڑا وہ اب عدالت میں ہماری
ساکھ اپنی کا وہ حاکم بن رہا خود چور ہے اب

دے رہا ہے حوصلہ ڈرنا نہیں میرے جوانو
جو مسلط ہے سروں پر وہ فقط منھ زور ہے اب

تھے بڑے دعوے بنائیں گے نئی اِک مملکت ہم
جھوٹ پر مبنی وہ وعدوں پر ذرا سا غور ہے اب

کر گریباں چاک اپنا خود بنا دشمن خودی کا
عام انساں کا خلاصہ فی صدی کچھ اور ہے اب

محمد فہد اشفاق

غزل

جب دوسروں کو ہنستے دیکھتا ہوں
خود کو ماضی میں ٹھہرے دیکھتا ہوں

تڑپ سی اٹھتی ہے اک دل میں
جب شاخ سے ٹوٹتے پتے دیکھتا ہوں

نظر آتا ہے ہر عروج کا زوال
سورج کو جب ڈوبتے دیکھتا ہوں

سلسلہ جب چلتا ہے تری یادوں کا
تجھے ساتھ مخاطب اپنے دیکھتا ہوں

جب بھی نکلتا ہوں کسی راہ پر
ساتھ اپنے کسی کو چلتے دیکھتا ہوں

پُرمسرت ساعتوں کو مٹھی سے
میں ریت کی طرح نکلتے دیکھتا ہوں

محمد فہد اشفاق

غزل

حیوانوں سے نہیں اب انسانوں سے ڈر لگتا ہے
ان چلتے پھرتے سایوں سے ڈر لگتا ہے

آسمان پر آئے بادل پریشان کرتے ہیں
اس کچے مکان کو بارشوں سے ڈر لگتا ہے

یہ جو اپنوں کو ساتھ بہا لے جاتی ہیں
مجھے وقت کی ان لہروں سے ڈر لگتا ہے

کہیں اب وہ پوری ہی نہ ہو جائیں
بے دھیانی میں کیں مناجاتوں سے ڈر لگتا ہے

میں امید کی دھوپ میں چلنے والا مسافر
مجھے یاس کی چھاؤں سے ڈر لگتا ہے

کسے دوست جانیے اور بتایے دل کی بات
اب تو اپنے رازداروں سے ڈر لگتا ہے

ترا خیال آتے ہی میں آنکھیں کھول لیتا ہوں
جن کی تعبیر نہیں ان خوابوں سے ڈر لگتا ہے

سیّد علی مدثر

غزل

وہ کہہ رہا تھا ہمارے آنگن میں تم جو آتے تو عید ہوتی
ہمارے سینے فراق کے غم میں جل نہ جاتے تو عید ہوتی

تمھارا آنا، تمھارا جانا، یہ کام ہوتا رہا ہے اکثر
اب آگئے ہو تو ایک شاپر میں گوشت لاتے تو عید ہوتی

وہ کہہ رہا تھا یہاں کی گندی فضا میں رہ کر میں تھک گیا ہوں
اب اس دفعہ تم ہمیں سِکردو میں لے کے جاتے تو عید ہوتی

یہاں پر اگلے ہی روز کوئی ستم کی زد میں رہا ہے لوگو
ستم کے مارے، ستم گروں سے قرار پاتے تو عید ہوتی

تمھاری آمد کا منتظر ہے، بس اِک ملاقات کی تڑپ ہے
ہماری خاطر نقاب رُخ سے اگر ہٹاتے تو عید ہوتی

پنجابی

- مضامین ۱۰۷
- افسانے / کہانیاں ۱۱۰
- ڈائری نویسی ۱۲۰
- رپورتاژ ۱۲۴

زاہد حسن

آ بھین فاطمہ!

''آ بھین فاطمہ'' بلدیو سنگھ دے قلم دا شاہ کار اے۔ اوہ پنجابی دے اِک اعلیٰ کہانی کار تے ناول کار نیں۔ اوہناں دا ایہہ افسانہ ۱۹۴۷ء دی وَنڈ بارے اے، جیہدے وچ اِک سکھ تے مسلمان زنانی دی آپسی محبت نوں موضوع بنایا گیا اے۔

شروع وچ تاں ایہہ افسانہ گھر دے سٹور دی صفائی دا منظر بیان کر دیاں ہویاں ہر گھر دی کہانی معلوم ہوندا اے۔ کہانی دے راوی دے طور تے بلدیو سنگھ لکھدے نیں:

> ''میں حیران آں، بے بے پتہ نہیں کیہ کُجھ چُک چُک اندر سٹور وچ سُٹدی رہندی اے۔ اج بے بے شاید گوانڈھ وچ کسے دے گھر گئی ہوئی اے، نہیں تاں ہُن وی اوس ساڈی کر توت تے کھِجناں سی، تے وچوں چیزاں چُک چُک پچھناں سی '' آہ کاہنوں سُٹی جانیں؟''۔

اگے جا کے بے بے دی چرخے نال محبت دے ذریعے بلدیو سنگھ کہانی دا اصل مقصد واضح کر دے نیں۔ بے بے جدوں گوانڈھیاں دے گھروں واپس آوَندی اے تے ویڑھے وچ سامان کھلریا ویکھدی اے۔ اوتھے وِیچن لئی پیا چرخہ ویکھ کے دُکھی ہو جاندی اے۔ اوہناں صاف کر کے لاہمے رکھ دیندی اے۔ ایہہ چرخہ اوہدی سہیلی فاطمہ دی امانت اے۔ جو ونڈ ویلے اوہ اوہدے کول بہ طور امانت رکھوا کے جاندی اے۔ چرخے نال جڑیاں یاداں نوں بیان کر دیاں ہویاں بے بے دسدی اے:

> ''مینوں بھورا بھورا یاد اے آتھن (شام) جیہے داویلا سی، جدوں فاطمہ روندی ہوئی آئی اپنے گھر۔ آکھدی کُڑے سنیا ملک جاد ہو گیا۔ نالے پاکستان اڈ بن گیا۔ سانوں تاں

اودھر جاناں پَو۔ جان لگی آہ دے گئی سی مینوں، آکھدی سی ''پُتاں نالوں ودھ پیارا اے۔''

بے بے نے ایہہ چرخہ ایس اُمید تے سانبھ رکھیا سی کہ ہورے کدی فاطمہ ایہنوں لین آجاوے تے دوبارہ سہیلیاں دی ملاقات ہو جاوے۔ بھاویں بے بے نوں ایہہ وی علم نہیں سی کہ فاطمہ جیوندی وی سی یا نہیں۔ ایس طرحاں ایہہ افسانہ چرخے دے ذریعے جُڑیاں پر حقیقت وچ ونڈ ویلے وچھڑیاں دو سہیلیاں دی محبت تے وچھوڑے دی داستان سناؤندا اے۔

۴۷ء دی تقسیم بارے، تقسیم دے نتیجے وچ ہوئے فسادات تے ہجرت بارے اردو تے پنجابی دے اہم تے وڈے لکھاریاں دیاں لکھیاں کہانیاں ملدیاں نیں۔ جنھے سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر تے احمد ندیم قاسمی ورگے کئی نام ور لکھاریاں آپنیاں کہانیاں راہیں ایہنوں موضوع بنایا اوتھے ای کلونت سنگھ ورک، بلدیو سنگھ، دیوندر ستیارتھی تے امرتا پریتم ہوراں ایس گھٹنانوں آپنیاں کہانیاں وچ تھاں دتی۔ بھاویں باقی کہانیاں وچ زیادہ تر مہاجراں دے اُجاڑے تے نویں تھاں جڑھاں پکیاں کرن دوران اوکڑاں تے مشکلاں دا ای ذکر ملدا اے پر ایہہ افسانہ ہجرت توں پہلاں تے بعد دے دو وکھ وکھ مذھباں دیاں زنانیاں دی وارتا بیان کردیاں اُچے تے سچے انسانی رشتیاں نوں بیان کردا اے۔ انج ایہہ افسانہ اُکا اک نویں تھیم لے کے ساہمنے آوندا اے۔

افسانے وچ نہ صرف پنجاب دے گھراں دا ماحول وِکھایا گیا ہے سگوں ایہہ افسانہ مختلف مسائل تے وی روشنی پاندا اے۔۔۔ جدوں گھر قلعی کروایا جاندا اے تاں بے بے چرخہ وی قلعی کروالیندی اے۔ ایس گل تے اوہدا پُتر غصّے ہوندا اے، تے بے بے دیاں نوہاں (بہوئیں) اوہنوں مخول کردیاں نیں:

''بے بے ہُن سُوت کتیا کرو گی''۔ چھوٹی نونہہ بے بے نوں سُنا کے وڈی نوں آکھدی اے۔

''آپاں تاں کڑی دے ویاہ ویلے بے بے نوں ای کھیساں دڑّیاں دا ٹھیکہ دے دینے

آں"۔ ایس گل تے چھوٹی کِھڑ کِھڑ کے ہس پئی اے۔"

کہانی دے ایس حصّے وچ نہ صرف پڑھن والیاں نوں دو نسلاں دی سوچ دا فرق تے نویں نسل دا احساس توں خالی ہوونا ں نظر آؤندا اے سگوں ایہہ وی پتہ چلدا اے کہ نویں نسل نوں اپنے بزرگاں دی اوس تکلیف دا احساس نہیں ہو سکدا، جو ونڈ دے دُکھ تے پیڑاں توں گُزر کے اوہناں برداشت کیتیاں۔

افسانے وچ مختلف احساسات تے خیالات بڑی باریکی نال بُنے گئے نیں تے ایہی خوبی ایہنوں بے مثال بنا ندی اے۔

سید محمد عبداللہ

حق شکور سرکار

کاٹھ دا بوہا ادھا کھلیا سی۔ کجھ لوکی لنگھدے ٹردے آئے، تے کجھ ہوا دے چلن نال، مٹی کچی گلی اچ اُڈن لگی سی۔ اوہ گھر وچ رولے تو چِڑ کے باہر بہہ رہیا۔ دھول اوہدیاں ناساں وچ وڑدی سی پئی۔ ہر آندا جاندا بندا اوس نوں گھٹ لیندا تے "میر اپُتر، میر اپُتر" کہی جاندا۔ ایس توں پہلے سارے اوہنوں شکورا کہندے سن۔ اندروں ترے نیانے کھیڈ دے باہر نوں بھجے۔ ہک نے جاندیاں بوہے نوں دھکا ماریا تے اوہ ٹھک کر کے کندھ نال جا وجا۔ گھبرا کے اوس نے اوہناں بالاں نوں ویکھیا۔ زنانیاں دے رون دی آواز وچ ایہہ پہلی وکھری شے سی جیہڑی اوس ویلے توں ایہدے کنّی پئی سی۔ اوس دا دل کیتا کہ اوہ وی جا کھیڈے لیکن کسے نامعلوم حِس دے تحت کہ اوہدا کھیڈنا نہیں بندا، اوہ بیٹھا رہیا۔ اوہدے پیو دی منجی باہر ہوئی تے لوکاں اوہنوں وی نال لے لیا۔ واپس آیا تے اوس دی ماں اوہنوں پھڑ کے اپنے سینے نال گھٹ کے دھاڑاں مارن لگ پئی۔

"روندا کیوں نہیوں؟ کھُل کے رولَے، تیرے پیو نوں دفنا آئے۔"

"مَیں اس دیہاڑے کیوں نہیں رویا؟"

پیر جی ایہناں سوچاں وچ گم سن کہ اچانک اِک بندے آ کے اوہدا ہتھ چُمیا۔ اوس نے سری چکّی تے ہجوم اوہدے دوالے کٹھا ہویا سی۔ کئی کہہ رہے سَن "پیر ہوراں میّت اچ کُجھ ویکھیا اے"۔ کجھ زنانیاں پرے کھلوتیاں کھُسر پھُسر کر رہیاں سن کہ "اسمِ اعظم پڑھ رہے نیں"۔ کئی کہہ رہے سن "جنازے دا ٹیم اگانہہ کر دیو، پیر ہوری میت دی پاکیزگی دا وظیفہ کر لین"۔ ایہہ ساریاں گلاں سندیاں ای اوس نے میّت ول تک کے اُچی پھوک

ماری۔ اوس نوں ایس پنڈ دے بندیاں از راہِ رحمت اک جنازے تے بُلایا سی۔ اوتھے میّت دی منجی ویکھ کے اوہنوں اپنے ابّے دا مرن یاد آ گیا، جس توں بعد اوہ اپنی ماں نوں چھڈ کے سنمیال نس آیا سی۔ سنمیال دیاں سوہیاں پہاڑیاں چوں اوس نے سنیاسی نمک نکلدا اے۔ اوتھے نمک کڈھن آلیاں وڈیاں مشیناں ہوندیاں نیں جیہناں تے اچے بندے باہر لے آ کے کم کر دے نیں۔

سنمیال اپڑ کے اوس نوں مشیناں تے نہ لبھیاں لیکن ساری دیہاڑی دربدر ہو کے اوہ بھکھم بھانے اِک آستانے تے جا کے بہہ رہیا۔ اوتھے نال ای اِک ڈلی وگدی آئی جتھوں ربّ نے اوس نوں پانی پیایا۔ آستانے آن آلے کجھ لوکی اوہنوں مکھانے پھڑا گئے۔ کھاپی کے اوتھے ای بوڑھ تھلے اوہ سوں رہیا۔ اوہ آستانہ اِک موتی پیر دا سی۔ پیر نے اوہنوں بال ویکھ کے اپنے آستانے تے رکھ لیا۔ صبح شام خدمت کرائی تے اٹھ پہری روٹی ٹکر دے چھڈیا کرنا۔ موتی پیر دی کوئی اولاد نہیں سی لیکن لوکاں دے گھر آباد کرن لئی مشہور سی۔ اوس دے مرن توں بعد شکورا آستانے دا وارث بن گیا۔ دم درُود تے اوہنوں کرنا آؤندا کوئی نہیں سی پر پھوکاں دا ول اوہ پرانے بابے کولوں ویکھ ویکھ کے سکھ گیا سی۔ ڈلی دا پانی پھوکاں مار کے لوکاں نوں پیا دیندا۔ بابے موتی آلے نوشادر دے محلول شیشیاں اچ رکھے سن، کسے کپڑے / ورقے تے پایئے تے نوشادر دِسدی نہیں سی لیکن جدوں اگ بھکھدی تے نوشادر ظاہر ہو جاندی۔ جیہڑے لوکی اولاد حاصل کرنے تے گھریلو مسائل واسطے آؤندے، اوہناں سامہنے دل کر دا تے نوشادر لگا کاغذ بالدا۔ جے دھیّے نظر آجاندے تے اوہناں دا مطلب ایہہ دسدا کہ میاں بیوی دے رولے یا بانجھ پن دی وجہ جادو ٹونا اے۔ جے کدی نوشادر استعمال نہ کر دا تے کاغذ اتے دھبے نہ آؤندے۔ کُجھ ول تے کُجھ ربّ دی لکھی نال اوہ اناں نال آلے پنڈاں تے دُور دراز لوکاں اچ پہنچے پیر دا ہو گیا۔

پرانی بان دی منجی تے مائی آ کے بیٹھی تے کڑ کڑ کر دی منجی آپنے بھُر دیاں واناں نال چٹکی۔ گھر اچ ایہہ اِکو پُرانی منجی سی۔ اوہدی دھی اوہنوں نویں منجی لین دا کہندی تے اوہ جواب دیندی کہ ”تھاں نہیں اے۔“ گل اوہدی وی ٹھیک سی۔ کاٹھ دے بوہے آلے ایس گھر وچ اکو ای کمرہ سی تے نال اک باورچی خانہ جیہدے باہر

ٹھنڈا رہن آلا تندور۔ اوس اک کمرے وچ اوہ پرانیاں پیٹیاں جمع سن، جیہڑیاں اوہنے کڑی دے جہیز واسطے بنائیاں سن لیکن اوس دے سُسرالیاں نے حال وچ ای واپس کر دتیاں، جس وجہ نال تھاں صرف اکو منجی دی بچی سی۔ اوہ ہلے بیٹھی ای سی کہ اوہدی دھی اک چھابے وچ روٹیاں لے کے آئی۔

''چل اماں چھیتی کھالے، اساں اج سنمیال وی جاوناں اے۔ ساڈے پلّے ککھ وی نہیں، تے میری سس مینوں اگے ہی نہیں سمجھدی اے۔ اوہنے آکھیا پیر جی دی آشیر باد توں بغیر گھر واپس نہیں آؤنا۔ سنیا اے کہ پیر جی بڑے پہنچے ہوئے نیں۔ ہُن اِکو ای آسرا اے۔''

''اوہ اچھا۔ کنی واری دسیں گی، بس نکل رہے آں۔''

''چُوا سیدپور، اوہناں دے پنڈ دے کولوں اِکو لاری لنگھدی آہی جیہڑی سنمیال جاندی سی۔ اوسے لاری تے مائی اج توں ستارھاں سال پہلے اپنے شکورے نوں لبھن گئی سی۔ اوہ شکوراتے اوہنوں نہ لبھیا پر غربت تے مایوسی جیویں اوہ اپنے نال گھر لے آئی۔ دھی نوں جواب دیندیاں اوہنوں شکورا یاد آگیا، تے مائی دیاں اکھّاں اُمید نال چمک ماری۔ ایہہ اُمید اوس دے واسطے نویں سی۔ اوہدی دھی میرن داویاہ کچّی عُمرے ای ہو گیا لیکن ترے سالاں بعد وی اولاد نہیں سی ہوندی۔ دوہاں ماواں دھیاں اوس صبح اپنی اپنی اولاد واسطے پیر حق شکور کول جاوناں سی تے ایس فکر اچ سَن کہ سنمیال آلی گڈی نہ نکل جاوے۔ مائی چھیتی چھیتی روٹی کھاکے آکھیا:

''چل میرن اُٹھ، مینوں لگدا اے کہ رب ساڈیاں مُراداں پیر ہوراں دے وسیلے نال پُوریاں کرے گا۔''

دوویں ماواں دھیاں بھری لاری اچ بیٹھیاں۔ دو گھنٹے بعد سوہے پہاڑاں آلے پنڈ داخل ہوئیاں۔

''میرن اُٹھ! سنمیال آگیا ای۔'' مائی نے آکھیا، تے میرن جیہڑی سوں گئی سی، اُٹھ کھلوتی۔

ماں نے آپنیاں پوٹلیاں کسّیاں تے دھی نوں نال لے کے اوس دے آستانے آن اپڑی۔ اوہدی ماڑی حالت ویکھ کے بار بار مجاور اوہنوں آکے پُچھدے!

''مائیے، سرکار جی دا نذرانہ تے لیائی ایں ناں؟''

''آہو آہو، لیائی آں!'' اوہ اِک پوٹلی ول اشارہ کر کے کہندی۔

شکورا ہر بندے کولوں نذرانہ لیندا سی تے چنگی بھلی دولت اوس نے ایس بہانے جمع کر لئی سی۔ وڈیاں اسامیاں کولوں اوہ ڈنگراں دا نذرانہ لیندا سی۔ کئی مجھاں، وچھے تے کٹے قربانی بہانے اوس نے اپنی کھُرلی بدھے ہن۔ مائی ڈنگر تے نہیں سی دان کر سکدی پر کجھ روپے اِک پوٹلی اچ بنھ لیائی سی۔

آخر پیر ہوری ظہر توں بعد اپنی مسند تے آ کے بیٹھے۔ مرید اں تے دُکھیاراں دا اِک ہجوم اوہناں ول لپکیا لیکن مجاوراں روک کے اِک اِک کر کے سلام کراناں شروع کر دِتا۔ مائی دی واری آئی تے اوس نے وی اگا نہہ ہو کے ہتھ چمّے۔ شکورے دی مائی تے نظر پئی تے بے اختیار ہتھ چھُڈالیا۔ ایہہ جھرّیاں آلا مونہہ اوہدی ماں دا سی۔ مائی دے چہرے اُتے فکر مندی دے آثار ویکھ کے اوہنے ہتھ واپس کر کے اوہدے سِر اُتے رکھ دتا۔ شکورے ویکھیا تے اوہدی بھین جیہڑی اوس ویلے بڑی نِکی سی، اوہ وی نال ای بیٹھی سی۔ اوس دا دِل کیتا کہ اُٹھ کے منھ چھُپاوے لیکن اوہناں دی خستہ حالی تے ناشناسی ویکھ کے بیٹھا رہیا۔

''کیہ مسئلہ جے؟''

''ایہہ میری کُڑی جے۔ ویاہ نوں تریجا سال لنگھ چلا، ایہدے گھر اولاد نہیں ہوئی، پیر جی۔'' اوہدی ماں کہیا۔

''اوس نے کجھ دیر غور نال اپنی بھین ول ویکھیا جیہڑی سِر سُٹی بیٹھی سی۔

''ہو جائے دا۔ مایئے! تیر اوی کوئی مسئلہ اے؟'' اوس نے اپنی ماں ول تکیوں بغیر پچھیا۔

''پیر جی میں سُنیا سی تسی وچھڑیاں نوں ملا دیندے او۔ میر ا اِک منڈا اے، کئی سال پہلے اوہدا پیو مریا تے سانوں چھڈ کے نَس گیا سی۔ میں ہلے وی اوہنوں جاچنی آں۔ مرن توں پہلاں جاننا چاہنی آں کہ میر ا پُتر مَر گیا کہ جیوندا اے۔ تُسی اوس دی خبر دس دیو، یا اوہنوں وکھا دیو۔ گھر دی پُنجی وی تہاڈی نظر کر دیاں گی۔۔۔''

سُندیاں سُندیاں اوہ کئی وار اندروں ہلیا۔ کدی ندامت تے کدی ترس دے جھٹکیاں نال۔ ویکھن آلیاں ایہہ ہی سمجھیا کہ پیر صاحب اُتے وجد آ رہیا اے۔ مائی وی ایہہ ای سمجھ کے چُپ ہو رہی۔

''مائیے! تیرا بال جیوندا اے، سمجھ تیرا کم ہو جائے دا۔ ایہہ پوٹلیاں کیوں نال بدھیاں نیں؟'' اوہنے کنبدی لیکن بھاری آواز وچ پچھیا۔

''سرکار! اِک وچ تہاڈا نذرانہ اے، اِک وچ کھان پین دے پیسے نیں جیہناں وچوں بہتے لگ گئے نیں تے اِک وچ واپسی دا کرایہ اے۔''

شکورے نوں ہور کجھ سمجھ نہ آئی تے دو لونگاں تے پھوک مار کے اپنی بھین اگے سُٹ دِتیاں۔

''ایہہ چبنیاں نیں تے پیر مکی دا وظیفہ پڑھنا اے۔ ہُن جاؤ۔''

''ایہہ کہہ کے شکورا اُٹھ کھلوتا۔ واپس آیا تے اوس دی ماں نذرانے آلی میلی پوٹلی اوہدی مسند کولے چھڈ گئی سی۔

کیہا جاندا اے کہ ایس توں کُجھ دن بعد اوہ راتو رات آستانہ چھڈ آیا۔ ڈاڑھی کُتری، لیراں لاہیاں تے لاری تے بہہ کے اپنے پنڈ چُواسیدپور آن اپڑیا۔ اوہنوں اپنے گھر دا کاٹھ آلا بوہا یاد سی۔ اوہ لبھدا لبھدا سدھا اپنے گھر اپڑیا۔ صبح پنڈ وچ سب عورتاں کہندیاں پھردیاں سن کہ سنمیال آلا پیر بڑا پہنچیا اے۔ شکورا واپس آ گیا اے۔ اوہدی ماں ہر اِک نوں، پروہنے باہر لے نوں دَسدی کہ کس طرح پیر جی تے اوہدی گل سندیاں کشف ہویا سی۔ اوس دی بھین جدوں ویکھیا کہ میرا بھائی واپس آ گیا اے، تے اوس دی اپنی اُمید وی جاگ پئی۔ اوہ ہلے تیکر سنمیال توں لونگاں لیاوندی تے پیر مکی دا وظیفہ پڑھدی اے، لیکن پیر ہوری ہن اوتھے نہیں بہندے۔

علی رضا

اشرافیا

''اماں اج روٹی وچ کیہ ہیگا؟''

''پتر، انج کرتوں باہر ٹورالائی آ، میں جد سالن پکالواں گی تے تینوں سد لواں گی۔''

ایہہ کہہ کے اوہنے اپنے پُتر نوں باہر گھل دتا، تے خود منجی تے لمے پے کے، دیوار ول منھ کر کے روون لگ پئی۔ اج تیجا دن سی اوہ مُنڈے نوں لارے کران ڈیہی سی۔ اوہ، خود چار دناں توں بھکھی تے پیاسی سی۔ اوہدے دل وچ مُنڈے دی بھکھ تے پیاس دابڑاہر کھ سی۔ اوہ چاہندی سی اوہدیاں اکھاں وچ ہی اتھرو آجان، تے اوہدے نال اوہ گلاس بھر کے منڈے دی بھکھ مٹاوے۔

اج دے جدید دور وچ اوہدے گھر بجلی نہیں سی۔ میٹر تے واپڈا آلے مہینے دے پہلے دن ہی کٹ لے گئے سن۔ ساری دنیا تے پنجاں دناں توں روزے رکھ رہی سی، لیکن اوہ تے پچھلے پندرھاں دناں توں مجبوراً روزے رکھ رہی سی، جیہناں وچ پچھلے چار دن فاقیاں دے سن۔ روزیاں دا کر کے منڈی بند سی تے اوہ اپنیاں سہیلیاں توں وی کجھ منگ نہیں سکدی سی۔ جد بھکھ اسمانے ہتھ لاندی ہووے تے نیندر وی زمین دی ستویں تہہ وچ وڑ جاندی اے۔ اخیر اوہنے افیم دی نکی جیہی نکر ٹکی تے اوہدیاں اکھّاں نیندر نوں واج مارن لگ پئیاں۔ جد اوہدیاں اکھّاں دا اگلا بہہ گیا تے نیندر نے وی گھوڑے ور گوں نٹھدیاں اوہنوں جپّھی پالئی۔ نیندر اوہنوں اوہدے لنگھے ہوئے وقت وچ انج دھر وہ لے گئی، جیویں سنگلی وچی بکری نوں اوہدا مالک گھسیٹدا اے۔

سپنے دی شروعات اوہدے بچپن توں ہوندی اے، جد اوہ اپنی ماں نال لوکاں دے گھر کم کرن جاندی سی۔ بچپن ہر اک دا سوہنا تے چین والا نہیں ہوندا۔ اوہدی قسمت وچ تے اپنے ہان دے بچیاں نوں ویکھ کے اپنی

قسمت نوں کوسنا ای سی۔ اوہ اپنے نکے نکے ہتھاں نال لوکاں دے گھر بھانڈے مانجدی تے ٹاکی پھیر دی، کم ٹھیک نہ ہون تے نکی جیہی کڑی نوں ایویں جھڑکاں ماردے جیویں اوہ اوہناں دی خریدی ہوئی غلام ہووے۔ ماں پیو دا پیار اوہنوں گھٹ ہی لبھیا۔ اوہناں دا دھیان اوہدے دوجے ست بھین بھراواں ول وی نہیں سی۔ ماں لوکاں دے گھر کم کرن وچ ہڈیاں بھندی تے پیو کھوتا ریڑھی تے سارا دن مٹی ڈھوندیاں شہر وچ لور لور کھپدا۔

وقت لنگھدا گیا تے اوہنے اک سوہنی جوان کڑی دا روپ دھار لیا۔ گلیاں وچ ٹردے پھردے اوہدی اکھ اک منڈے نال لڑ گئی، جیہڑا گلی وچ ہر ویلے کھلوتا اوہنوں تاڑدا سی۔ منڈے دا پیو کنک دا بیوپاری سی تے اوہ اپنے ابے دی دکان تے بہندا سی۔ منڈا گھر آلیاں نال لڑ پیا کہ اوہنے ایس ای کڑی نال ویاہ کرانا اے۔ جد اوہدے ماں پیو راضی نہ ہوئے تے دوناں نے نٹھ کے ویاہ کرن دا منصوبہ بنالیا۔ جیٹھ دے تتے دناں وچ اوہدے پیونوں لُو لگ گئی تے بخار ہو گیا۔ سارا دن اوہدا پیو نیندر وچ بولی جاندا تے اوہدا جسم بھانبھڑ ورگوں اگ ورھاندا۔ جس رات کڑی گھروں نٹھن لگی اس راتی پیو دی اکھ کھلی سی۔ جد اوہ گھر دا بوہا ٹپن لگی تے اک تپدے ہتھ نے اوہدی بانہہ پھڑ لئی۔ اوہ پچھانہہ پرتی تے اپنے پیونوں ویکھ اوہدے ہوش اُڈ گئے۔ پیو نے اپنی پگ اوہدے پیراں وچ رکھ دتی، تے کیہا:

''پُتر توں میری جان ایں، پر ایہہ کم نہ کر۔ میرا نہیں تے اپنی ماں دا ای خیال رکھ لے۔ اوہ تے جیوندے جی ہی مُک جاوے گی۔ میرا کیہ اے، میرے تے سر اتے موت بیٹھی اے۔ میں کل گل کر داں منڈے دے پیو نال۔ توں دل چھوٹا نہ کر۔''

''سچی؟ پر ابّا، اوہ من جاون گے؟''

''ہاں اک پیو دی زبان اے ایہہ''۔

اگلے دن اوہدا پیو منڈے ول گیا، واپسی تے بے عزتی تے نموشی لیایا۔ اوہنے پیو دے آندے ای سوالاں تے سوال پُچھے، پر اُن ساریاں سوالاں دا اک ہی جواب دتا:

''شریفاں دے گھر کنجر چنگے نہیں لگدے''۔ اس توں بعد پیو نے چُپ سادھ لئی۔

ادھی رات نوں پیو دی عزّت نے اوہدی سنگھی نپتی تے صبح اوہدی میّت گھروں نکلی۔ ماں نوں ہُن اوہدی فکر کھان لگ پئی۔ ماں نے کافی ہتھ پیر مارے تے ایک نمازی پرہیزی، حافظ مُنڈے دا رشتہ لبھ لیا۔ ویاہ توں بعد اوہدا شوہر اوہنوں وڈے شہر لے گیا، جتھے اوہ نوکری کردا سی۔ اس دے نال پہلاں تے ڈاڈھے چنگے دن لنگھے۔ اس دے بعد اس نے اپنے بندے دیاں عجیب حرکتاں نوں جاچیا۔ اس دا شوہر رات نوں اکثر نشے وچ آندا سی تے ہر ویلے اس نوں جھڑکدا رہندا سی۔ بعد وچ پتہ لگیا کہ اوہ تے نشے تے جوئے دا پرانا عادی اے۔ اوہدے بندے نے ہولی ہولی گھر دیاں چیزاں ول نظر رکھ لئی۔ کدی کوئی شے ویچی آندا، کدی کوئی۔ اخیر ووہٹی دے جہیز دیاں شیواں وی وکن لگ پئیاں۔ بھانڈے، بسترے، زیور سب جوئے تے شراب دے پچھے وکدے رہے۔ شرابی تے جواری نوں اپنی شراب تے جوئے نالوں کوئی شئے ودھ کے نہیں ہوندی۔ اک دن تِن بندے اوہدے گھر دے باہر سن۔ پتہ لگیا کہ اوہدا بندا اوہنوں جوئے وچ ہار آیا سی تے گھر قرضے دے سلسلے وچ نیلام ہونا سی۔ اوہ روئی تے پٹّی، پر اوہ سارے محلے دے سامہنے اوہنوں چک کے لے گئے، کسے ہمسائے دی غیرت نہ جاگی۔ اوہ بندے اوہنوں اپنے ڈیرے دے نیڑے اِک گُھپ کمرے وچ بند کر کے چلے گئے۔ جد اس بندے دے منڈیاں نوں پتہ لگا کہ ابّا اک کڑی ڈھکی پھردا اے، اوہناں نے اپنے ابّے نوں آکھیا:

''ابّا، سارے شہر وچ اسی شریف تے معزز سدّے جاندے آں، تے تُسی اس عزّت نوں مٹی وچ رولنا چاہندے او۔''

''فیر کیہ کریئے، پیسہ کتھوں لواں ایہدے خصم دے قرضے دا۔''

''ابّا جی، میری منّو تے میرا اک دوست اے دلال بازارِ حسن وچ، اوہنوں آکھ کے میں اس کڑی نوں کوٹھے والیاں نوں ویچ دیندا اں۔ وصولی دی وصولی تے ساڈی نیک نامی ہور شرافت تے کوئی نوہندروی نہیں مار سکدا۔''

ہُن اس دی زندگی پلٹا ہی کھا گئی۔ کتھے اوہدی ماں نے نیک نام شوہر لبھیا سی، کتھے اوہ ہن بازارِ حُسن دی اک مورت سی۔ ایس ای بازار وچ اوہدا اک منڈا اجمیا، جیہڑا اس دے کم ظرف تے کمینے شوہر دی نشانی سی۔

اوہدی کوٹھے دی مالکن نے منڈے دی سنگھی دبن دی کوشش کیتی، مگر ماں دی ممتا نے اس بچے نوں مرن توں بچا کے سینے لا لیا۔ اج اوتھے اوہنوں دس سال ہو گئے سن تے اوہدے منڈے توں علاوہ اوہدا کوئی سہارا نہیں سی۔ اوہ اک چوبارے تے کلّی رہندی سی۔ منڈا رات نوں منڈی ویلے دو جی کنجریاں دے بَچیاں نال سوندا تے صبح سارے بچے اُٹھ کے اپنی ماواں کول ٹُر جاندے، ناشتہ کر کے کنجریاں دے بچیاں دے سکول پڑھن جاندے کہ سماج وچ وڈاناں بنا سکن۔

جد اوہدی اکھ کُھلّی تے باریاں وچوں روزہ کھُلن دی واج آن ڈیہی سی۔ اخیر ہمت کر کے اوہنے اج کُجھ راشن تے پانی نال دی بیسو اواں کولوں منگ لیا۔ اُوہناں نے پہلاں تے مُنھ تے وٹ چڑھایا کیوں کہ اوہ خود ساریاں سرکاری بندشاں توں تنگ سن۔ روزے چل رہے سن تے محلہ بند سی۔ روزیاں توں پہلاں پلسیاں نے دیہاڑی واسطے ایویں ہی چھاپے مارنے شروع کیتے سن۔ ایسی وجہ توں منداچل رہیا سی۔ کھان پین دی تھوڑ سی۔ کنجریاں نوں تے کوئی زکوٰۃ وی نہیں دیندا، ایہہ سوچ، ترس کھا کے ساریاں نے مدد کر دتّی۔ اخیر اج اوہدے روزیاں دی وی افطاری ہوئی۔ منڈے نوں وی ڈھِڈ بھر کے روٹی کھوائی۔ نال ہی اوس خدا توں گاہک بھیجن دی دعا کیتی، جیہڑی ربّ نے کول ہو کے سُن وی لئی۔

لوکی کہندے نیں روزیاں وچ شیطان بند ہو جاندا اے، فیر ایہہ لوکی ہیرا پھیری تے منافقت کیوں نہیں چھڈ دے۔ اگلے دن اک بندے نے دروازے تے دستک دیتی۔ اوہ بوہا کھولدے ای بڑی حیران ہوئی، اوہدی پہلی محبت اوہدے درتے کھلوتی سی۔ اوہ اوہنوں اوتھے ویکھ گھبرا گیا۔ اوہنے اندر جا کے اس توں کافی گلاں پچھیاں تے کوٹھے تے اس بدنام محلے وچ آن دی پوری داستان سُنی۔ اخیر اوہنے اوہنوں اس جگہ وچوں کڈھن دیاں تے ویاہ کرن دیاں گلاں کیتیاں۔ اوہدے من وچ فیر جیون دی آس جاگ پئی۔

اوہ ہُن روز افطاری توں بعد چکّر لاندا تے اخیر گل گلاں توں اگے ودھ گئی۔ اوہ اپنے پرانے پریمی دی محبت وچ رُڑھ گئی تے اس نال اپنی محبت ونڈن لگ پئی۔ اکیہیویں روزے جد اوہ اپنی خواہش کئی واری پوری کر چُکیا، اوہنے اوس توں پُچھیا کہ مینوں کدوں اِدھروں باہر کڈھیں گا۔ اوس نے کہیا کہ میں تینوں دو دناں تیکر لے

جاواں گا۔ چار پنج روزے وی لنگھ گئے۔ جد ستائیویں روزے اوہ آیا تے اوہنے اوس توں پُچھیا تے اوہ چڑ گیا۔ اوہنوں سمجھ لگ گئی تے دل تے پتھر رکھ کے اتھرو روکدیاں، غصّے نال بیسوا آلے لہجے وچ اوہنے اپنے ان دناں دے پیسے منگے تے آکھیا:

''ساڈے بیسو اواں کول کھاتے نہیں او چلدے۔''

اوہنے اوہدے دروازے دی چوکھٹ تے تُھکیا تے آکھیا:

''میں تیرے پیسے کھاواں؟ لعنت ہووے میرے تے۔ مینوں کیہڑی تھوڑ اے پیسیاں دی۔ اسی شریفاں دی اولاد وچوں آں، کسی کنجر تیکر داوی پیسہ نہیں کھاندے۔''

ایہہ بولن توں بعد اوہ چوکھٹ وچوں لنگھ کے بوہا ڈھو کے ٹُر جاندا اے۔

عبدالمعید

میری ڈائری

۱۴ اکتوبر ۲۰۲۲ء، شکروار

اج صبح سویرے فجر ویلے میری اکھ گھڑی دے الارم دی واج نال کھُلی۔ میں ویکھیا کہ سویر دے پنج وج کے دس منٹ ہوئے ہن۔ میں اکھّاں ملدیاں اُٹھیا تے غسل خانے دا رُخ کیتا۔ نلکا کھولیا تے ٹھنڈا یخ پانی ملیا۔ سبھ توں پہلاں اپنے نبی کریم ﷺ دی سُنت تے عمل کر دیاں مسواک کیتی تے فیر وضو کیتا، وضو کر کے میں اپنے محلے دی جامع مسجد جا پہنچیا۔ فجر دیاں دو سُنتاں پڑھیاں تے پنج وج کے تریہیہ منٹاں تے جماعت کھلوتی۔ نماز پڑھ کے میں اپنی سوسائٹی دے گول باغ وچ سَت چکر لائے جیہدا اپینڈا تقریباً دو کلو میٹر بندا اے۔

ایہدے بعد میں گھر آیا تے میری ماں نے دیسی گھیو دا پراٹھا تے نال مکھن اُتے کھنڈ پا کے ناشتے پاروں مینوں دِتا۔ بعد وچ چاہ دا مگا پیتا تے اپنی ماں نال سنہرا ٹائم لنگھان توں بعد میں واپس اپنے کمرے وچ آ گیا، یونیورسٹی دیاں کتاباں کھولیاں تے پنجابی مضمون دے مڈ ٹرم امتحان دی تیاری شروع کیتی۔

تقریباً تن گھنٹے پڑھن بعد وں اخیر اَک کے دوبارہ غسل خانے نہان واسطے جاوڑیا۔ نہان توں بعد کپڑے بدل کے تیار ہویا تے گڈی پھڑ کے یونیورسٹی لئی چل پیا۔ یونیورسٹی پہنچیا تے پتہ لگا جو پارکنگ وچ ڈاڈھا رش سی۔ بڑی مشکل نال بوڑھ دے رُکھ ہیٹھ تھاں ملی، گڈی پارک کیتی۔ جمُعے دی نماز دا ٹائم ہو گیا سی میں کلاس وچ جان دی بجائے مسیت دا رُخ کیتا۔ جتھے میں جماعت نال مل کے جمُعے دی نماز پڑھی۔

ایہدے بعد لگا تار دو کلاساں لئیاں تے تھک ٹُٹ کے اپنے بیلی نوں فون کیتا۔ اوہ آیا تے اسیں دوہاں

ای جا من جا کے کھانا کھادا۔ دوہاں ای اپنا اپنا بر گر کھادا جیہدا سواد پُورا پُورا سی لیکن پیسے وادھو دینے پئے۔ ایس توں بعد سُنت پوری کرن پاروں اسی لمزدے سٹور توں امب والی آئس کریم کھادی۔

خیر نال ہُن دیگر دی نماز دا ویلا ہو گیا سی تے اسی دوہاں یاراں نے مسیت جا کے رب دے حضور حاضری دِتی۔ نماز توں ویہلے ہو کے پارکنگ وچ دوہاں اپنی اپنی گڈی پھڑی تے اپنے اپنے گھر دا رُخ کیتا۔ رستے وچ ڈاڈھا رش سی۔ میں راہ وچوں اپنی امی نوں فون کر دِتا سی کہ ماں جی ڈاڈھی بھکھ لگی اے روٹی ٹکر دا بندوبست کر رکھو۔ گھر اپڑ کے ہتھ منھ دھو کے روٹی تے ٹُٹ پیا۔ ڈھڈ بھر کے کریلے گوشت کھادا۔ روٹی توں بعد شاماں دی نماز پاروں مسیتے جا پہنچیا۔ نماز پڑھ کے واپس گھر آیا تے اپنے ماں پیو دے نال ٹائم گزاریا۔ سوتے دی نماز مسیتے جا کے پڑھی تے واپس آ کے دُدھ سوڈے دا گلاس پیتا تے سوون واسطے اپنے کمرے جا وڑیا۔ اِک گھنٹہ موبائل ویکھن توں بعد میریاں اکھاں نیند رنال بھر گئیاں تے میں فجر دی نماز دا الارم لا کے سو گیا۔

---

۱۵ اکتوبر ۲۰۲۲ء، چھن چھن وار

سویرے سویرے میں اِک دم ہڑبڑا کے اُٹھیا۔ موبائل پھڑیا، ویکھیا تے پتا لگا کہ الارم بول بول کے کملا ہو گیا اے۔ صبح دے پونے ست وج رہے ہن۔ پوریاں اکھاں کھُل گئیاں۔ نماز ویلے وی الارم دی واج نال اکھ نہیں کھُلی۔ فجر دی نماز قضا ہو گئی سی۔ مینوں نماز دے قضا ہون دا ڈاڈھا دُکھ سی۔ اُٹھیا تے غسل خانے جا کے مسواک کیتی، مُنھ ہتھ دھو کے وضو کیتا تے گھر ای مصلّیٰ پا کے فجر دی قضا نماز پڑھی تے بعد وں تھلے ماں دے کمرے وچ آیا تے ماں نوں آکھیا نماز ویلے اکھ نہیں کھُلی۔ ماں کہندی مینوں لگا کہ توں اپنے کمرے وچ جاگ رہیا ایں تے ہُن ویہلا ہو کے ناشتہ کرن آیا ایں۔

میں ماں جی نوں آکھیا: ”اج چاء باقر خانی کھان نوں جی کر رہیا اے۔“ دساں منٹاں وچ ماں جی نے چاء باقر خانی تیار کر دتی۔ چاء دے وڈے پیالے نال باقر خانی کھادی۔ اج یونیورسٹی توں چھٹی سی تے امّی نے آکھیا کہ میرے نال سٹور چل، گھر دیاں ضروری چیزاں لیانیاں نیں۔ مَیں، میری امی تے چھوٹی بھین سٹور تے جا

اپڑے۔ میں سِر واہن والا برش، دنداں والا برش تے ٹوتھ پیسٹ لیا۔ بھین نے وی اپنی لوڑ دیاں چیزاں خریدیاں۔ امّی نے گھر دا سامان خریدیا تے واپسی تے نتھو قصائی دی دکان تے بریک لائی۔ جتھوں بکرے دی ران خریدی۔ جیہڑی گھر آ کے ماں جی نے رات دے کھانے واسطے چُلھے تے چاڑھی۔ پیشی دی نماز واسطے مسیتے گیا، جماعت نال رل کے نماز پڑھی۔

گھر واپس اپڑیا تے اگے میرا یونیورسٹی دا بیلی مدثّر آیا ہویا سی۔ مینوں کہندا اج چھٹی اے تے میرے نال امپوریم مال چل، میں اپنے لئی پینٹاں تے قمیصاں خریدنیاں نیں، اوہدے نال ٹُر گیا۔ واپس آئے تے دوپہر دے کھانے دا ٹائم ہو گیا سی۔ میں اپنے یار نوں وی نال لے کے اُتے اپنے کمرے وچ آ گیا، اسی رَل کے روٹی کھادی، بعدوں مدثّر اپنے گھر ٹُر گیا۔

شامی اپنی ماں نوں نال لے کے سوسائٹی دے گول باغ گیا تے واک پاروں باغ دے چکّر کٹے۔ گھر آیا تے چھوٹی بھین نے آکھیا کہ اَج تینوں چھٹی اے تے چل اسی ٹیلی وژن تے کوئی پنجابی فلم ویکھیے۔ میں مولا جٹ فلم لائی تے ڈھائی گھنٹے دی فلم ویکھن دا ڈاڈھا سواد آیا۔ شاماں دی نماز پڑھی تے روٹی کھادی تے سوون واسطے اُتے اپنے کمرے جا پہنچیا۔ کجھ ویلے بعدوں میں نندیا پُور جا اپڑیا۔

---

۱۸ اکتوبر ۲۰۲۲ء، اتوار:

اج اتوار اے تے سویر دے نو وجے موبائل فون دی آواز نال میری اکھ کھُلی۔ فون چکیا تے میرا بیلی عمران گل کر رہیا سی۔ مینوں آکھدا اے سرکار سویر دے نوں وج گئے نیں، اجے تیکر سُتے پئے او۔ فٹافٹ اُٹھو تے مُنھ دھو کے سِدھے ہو جاؤ، بازاروں ناشتہ کرن جانا اے۔ ادھے گھنٹے بعدوں عمران میرے ول آیا تے اسی دووِیں 'اُستاد منّوں سِری پاوے والے' جیہڑا چمڑا منڈی روڈ تے اے، اوتھے جا پہنچے۔ ڈاڈھا رش سی، بڑا اوکھیاں، ساڈی واری آئی، مغز تے کھدّ دا ناشتہ کیتا، مٹھی لسّی دے گلاس وی پیتے۔ مُڑ گھر واپس آ گئے۔

دوپہری روٹی توں بعد ساڈا اوپڑ اٹاؤن دی کرکٹ ٹیم نال میچ سی۔ جوہر ٹاؤن دی کرکٹ گراؤنڈ وچ میچ

شروع ہویا۔ اگلی ٹیم نے ٹاس جِت کے پہلاں کھیڈن دا اعلان کیتا۔ اوہناں ۲۰ اووراں وچ ۱۸۰ دوڑاں بنائیاں۔ ساڈے ولوں میں تے زبیر کھیڈن آئے، دوجے ای اوور وچ زبیر نے باؤنڈری تے کیچ پھڑا دتا۔ بعدوں عمران کھیڈن لئی آیا، میں تے عمران نے مل کے یاراں اووراں وچ نوّے دوڑاں بنا لیئیاں۔ عمران بارھویں اوور دی اخیر لی گیند تے رَن آؤٹ ہو گیا۔ بعدوں منیر کھیڈن آیا، مَیں تے منیر نے رَل کے مخالف ٹیم نوں رَج کے پھینٹا لایا۔ اٹھارویں اوور وَچ ای اسّی سکور پورا کر لیا۔ مَیں کلے نے پچاسی دوڑاں بنائیاں۔ ساڈی ٹیم دے سارے کھلاڑیاں نیں رَل کے بھنگڑا پایا۔

میچ توں ویہلے ہو کے گھر آیا تے پتہ لگا میری چھوٹی پھُپھی اپنے بال بچیاں نال ساڈے گھر آئی ہوئی اے۔ چھوٹی پھُپھی نال مینوں ڈاڈھا پیار اے۔ میں تے پھُپھی رَل کے گپّاں مار دے رہے۔ امّی نے واج ماری کہ سارے اکھٹے ہو کے ڈرائنگ روم وچ پہنچو جتھے رات دی روٹی ساڈا انتظار کر دی پئی سی۔ روٹی کھان بعدوں پھُپھی اپنے گھر ٹُر گئی تے میں اپنے کمرے وچ سوون دی نماز پڑھن توں بعد کجھ ٹائم موبائل تے لگا رہیا۔ سارے دن دی تھکاوٹ پاروں سارا اپنڈا پھوڑے وانگوں درد کر رہیا سی۔ بستر ے تے لمیاں پیا تے پتہ ہی نہیں کس ویلے اکھ لگی تے میں سوں گیا۔

عبدالمعید

ماں بولی ''پنجابی زبان'' دی اہمیت (رپورتاژ)

میرا اج دا دن یونیورسٹی وچ بڑا یادگار گُزریا۔ اج ساڈی یونیورسٹی وچ ''پنجابی ادبی پرھیا'' ولوں اک پروگرام کیتا گیا، جیہدے وچ پنجابی دے مشہور اخبار بھلیکھا دے چیف ایڈیٹر مدثر اقبال بٹ ہوراں شرکت کیتی تے اوہناں نال پنجابی زبان دے مشہور لکھاری الیاس گھمن وی تشریف لیائے۔

ایہہ اخبار پاکستان دا سب توں پرانا تے کلّا اخبار اے تے ایہناں نے اپنا اخبار چلان واسطے دن رات اک کر دِتا۔ ظاہری گل اے پاکستان وچ صحافت نوں ہمیشہ مشکلاں دا سامنا کرنا پیا اے۔ ایہناں دوہاں مہماناں نیں ساڈی ماں بولی ''پنجابی زبان'' دی لوڑ اتے روشنی پائی۔

اوہناں نے سارے طالب علماں نوں ایس گل دا احساس کرایا کہ سانوں اپنی زندگی گزارن واسطے پنجابی زبان بارے جان کاری کِنّی ضروری اے۔ دوجے صوبیاں توں آئے ہوئے بلوچی، سندھی تے پٹھان طالب علماں نوں وی ایس گل توں روشناس کرایا کہ جیوں تہاڈے صوبیاں وچ اپنی اپنی بولی بولی جاندی اے ایسے طرح صوبہ پنجاب وچ پنجابی زبان بولی جاندی اے۔ پنجاب پاکستان دا سب توں وڈا آبادی والا صوبہ اے۔ ایہدی زبان دی وی اہمیت اے۔

جس طرح اسیں باقی زباناں نوں اہمیت دیندے آں، اِنج ای اسی چاہندے آں کہ پنجابی نوں وی اوہو رتبہ دتا جائے۔ انگریز سرکار نے پنجابی زبان بولن لکھن تے پابندی لا کے زیادتی کیتی پر ہُن ضروری ہو گیا اے جو کسے وی طریقے ایہہ زبان ودھے پھُلے، سانوں ساریاں نوں مل کے چاہیدا اے کہ ایس تفریق نوں مکاون واسطے

اِک دوجے دے موڈھے نال موڈھالا کے ٹریئے تے اپنی ماں بولی دی حفاظت کریے۔ ایس معلوماتی چانن کاری دے بعد ساریاں طالب علماں نے رنگ برنگے سوال کیتے، جینہاں دا مہمان خصوصی نے تسلی بخش جواب دِتا۔

پروگرام دے اخیر اُتے ساریاں نوں اخبار ونڈیا گیا تے الیاس گھمن ہوراں اپنیاں پنجابی دیاں کتاباں تقسیم کیتیاں تے سارے طالب علماں دی حوصلہ افزائی کیتی۔ ساڈا خیال اے کہ ''پنجابی ادبی پرھیا'' ولوں ایس طرح دے پروگرام ہوندے رہنے چاہیدے نیں تا کہ اسیں اپنی ماں بولی دی تریخ تے تہذیب بارے جان کاری حاصل کریے۔

پشتو

- تعارف ۱۲۹
- نظم ۱۳۱
- غزلیں ۱۳۷

شاہ محمود خان

د طارق محمود صېب سر سري پېژندګلو

د دانش خپل نوم طارق محمود او قلمي نوم يې دانش دے . د پلار نوم يې حاجي ميرشهباز خان دے چې د وطن د پُولو يو بهادر محافظ پاتې شوے دے .

دانش صېب وړمبۍ ذده کړه په جي پي ايس نمبر ٥ بنوں ښار کښې تر لاسه کړه او ثانوي تعليم يې په ج ح س نمبر ۲ بنوں ښار ، ج م س بنوں ښار او ج ح س نمبر ۱ بنوں ښار کښې ترلاسه کړو . سي کام ، ډي کام يې د کامرس کالج بنوں نه ، دولسم او شپاړسم ''پښتو'' يې د ګومل پوهنتون ډيره اسماعيل خان نه وکړل او اېم اے ''اردو'' يې په بنوں پښتون کښې پوره کړه . پي ټي سي درس يې د اېليمنټري کالج بنوں نه ، د سي ټي کورس يې د ''رجسټرار دفتر پښور'' نه کړے دے . ددې سره سره اعلیٰ پښه ورانه سندونه د بي اېډ او اېم اېډ ډګرياني يې ترلاسه کړي دي . ډېره موده يې د پي ټي سي استاذ په حېثيت کار کړے دے . خو د کميشن امتحان پاس کولو نه پس په سرکاري کالج ''ګورنمنټ ډګري کالج سکندرخېل بالا بنوں '' کښې د پښتو ژبې او ادب معلم ''لېکچرار'' مقرر شو او لا تر اوسه د قام بچو ته پښتو او پښتونوالي ښائي .

ددې نه علاوه ئې د پښور پوهنتون '' پښتو اکېډيمي'' نه په پښتو ادبياتو کښې پي اېچ ډي Ph.D هم کړي ده۔

دانش يوائې د ټکو عکس جوړونکے نه دے بلکې د رنګونو شاعر هم دے يعني انځور ګر هم دے . د ډيرو کتابونو سر پاڼې د دوي په لاس جوړې شوې دي . د سوچ په حقله به يې دومره ووايم چې همېشه د خپل قام او انسانيت د ستونزو غم په سر اخستے لري او د ديني او علمي وکورنۍ له برکته د تمامو ستونزو حل د اسلام په اوچتو تعليماتو کښې لټوي . زما په دا دعوٰی يې که يو خوا '' حَیَّ عَلَی

الصَّلٰوة '' ګواه دے نو بل خوا یې نعتیه مجموعه" کاش چې زۀ هم صحابي و ے " د حقانیت ثبوت وړاندي کوي .

د طارق محمود دانش ټول نظمونه د ویښ ضمیر غږونه وي ـ چې څوک یې په ظلم اوحرص غلے کولےنه شي ـ " تۀ او زه او یوویشتمه صدۍ" نظم د پښتو نظم سترګي اوچتي کړې دي چې د تاریـخ د اهمې پائې او د شاعرۍ د فن د نادرې نمونې حېثیت لري ـ په دې نظم کښې عالمي منظرنامه او په دې منظرنامه کښې د خپل وطن او اولس تصویر ډېر ویرژن خو ډېر حقیقي او اثر لرونکے دے ـ چې د قلندر مومند د نظم " عالمي ضمیر په نوم " یاد تازه کوي ـ " تۀ او زۀ او یوویشتمه صدۍ"د عالمي سیاست په مخ زورداره څپېړه ده ـ

" بنګړي" نظم د خپل هېواد د سیاست او مفاد پرسته قیادت غلیظ مخونه بربنډوي ـ او داسې نور نظمونه یې هم د وخت او حالاتو ترجماني او عکاسي کوي ـ چې د فکر و نظر او فني ښکلا بهترینې نمونې دي ـ لکه په نظم " مسافر ته خط" کښې ئې د خپل وطن د معاشي استحصال تصویر راښکلے دے ـ په نظم " عېنکې " کښې یې د ملټي نېشنل کمپنیانو په طریقه واردات رڼا اچولې ده ـ په نظم " عالمي ضمیرته " کښې یې د انساني حقوقو علمبردارو هېوادونو د درنده صفت مخونو نه پرده پورته کړې ده ـ په نظم " پینځم موسم " کښې یې د طبقاتي معاشرې عکس ښودلے دے ـ په نظم " ترقیامته قبډي " کښې د ۱۹۳۰ د شهدائے سپینه تنګي د سردار (قاضي فضل قادر شهید) په اساس د ازادۍ د تحریکاتو چې کوم لهر وه په ګوته کړ ے دے او داسې نور د سلو نه زیات نظمونه لري۔

شاہ محمود خان

ځامنګي ته (نظم)

زما وړوکيه زامنګيه! د الله رحمته!
الله دې لوي کړه چې رحمت شې د هر چا د پاره

الله دې لوي کړه ځامنګيه ! زهٔ چې تاته ګورم
نو زړهٔ مې غواړي چې تل ګورم درته درته
په تصور کښې درته هر قسم ښکلا لټوم
د کائښناتو په کونه کونه کښې شورم درته

خو سوچ کوم چې داسې ګورم درته داسې نهٔ وي
چې په کتو کتو دې خپله د نظره کړمه
نظر د ښهٔ زړهٔ نه لګېږي زړهٔ مې ودرزېږي
چې داسې نهٔ وي چې دې ګله د نظره کړمه

خو دا نظر مې دومره لوي شي دومره وغزېږي
چې ستا د ښکلي مستقبل تصور مخته راشي
په مستقبل کښې دې په انګلش میډیم سکول کښې وینم
د تا په حقله یو قابل تصور مخته راشي

په سکول کښې واړه ماشومان درنه چاپېره وینم
د ماشومانو د سوالونو جوابونه کوې
کله د یو سره مسکے شې کله بل ته خاندې
په خنداګانو د ګلونو جوابونه کوې

الله دې لوي کړه زامنګیه ! زهٔ چې تاته ګورم
نو خیال مې دومره لرې یوسي چې ډېر لوي دې وینم
په یوه لویه یونیورسټي کښې د همځولو سره
هم په همځولو کښې د هر یو کس نه پوي دې وینم

کله د میډیکل کالج په خوا کښې کله راته
د انجنیئرنګ کالج په خوا کښې وښکارېږې
کله دې پاس د کمیشن په امتحان کښې وینم
کله د علم او ادب دنیا کښې وښکارېږې

کله په وینښه درته خوب وینم په خوب کښې راشې
په خوب دې وینم چې وخت لویه مرتبه درکوي
په یوه لویه چیوتره باندې یو لوي شخصیت
د ذهانت صله د سرو زرو تمغه درکوي

الله دې وکړي چې رښتیا شي دا په وینښه مې خوب
په وینښه خوب وینم په خوب ویښ شوے بخت دې وینم
د خپل وطن د آزادۍ سهرا دې وینم په سر
د خپل آزاد او خود مختار وطن په تخت دې وینم

الله دې لوي کړه زامنګيه ! زهٔ چې تاته ګورم
نو تاته دا قسم رنګين رنګين خوبونه وينم
په دا خوبونو او خيالونو کښې يوه لحظه هم
داسې به نهٔ وي چې تاته تکليفونه وينم

ولې به وينم په سينه کښې د پلار زړهٔ چې لرم
د پلار جذبات او احساسات او د پلار مينه لرم
د زړهٔ ټکړه چې درته وايم درته زړهٔ چې وايم
چې په رګو کښې دې د خپلو رګو وينه لرم

او بله دا چې په ظاهر خو زهٔ تاته ګورم
خو تاته نهٔ ګورم يوائې هر بچي ته ګورم
د هر بچي په مستقبل باندې نظر اچوم
د هر بچي پس منظر ته او ماضي ته ګورم

دا سوچ کوم چې دا به هم د چا د زړهٔ ټکړه وي
دا چې د کم عمر ماشوم دے خو کوي پنډي توب
په کار خو دا وه چې په ترخ کښې ئې بسته وې دسکول
خو دے کوي د خپل خيرن پالش ډبې پنډي توب

الله دې لوي کړه زامنګيه ! زهٔ چې تاته ګورم
نو تاته ډېر کتلے نهٔ شم دلته ډېر ماشومان
داسې هم شته دي چې د نس د مړولو په خيال
په ډېرانونو کښې هم غواړي د خوړلو سامان

داسي واړۀ واړه تنکي تنکي ګلونه وينم
چې د خزان په سخت نه سخت موسم کښې ساه اخلي
د لوړو تندو نه ئې خپې ننوتې ښکاري
د لوړو تندو په بدبخت موسم کښې ساه اخلي

دا سوچ کوم چې دا لغړ لغړ بچي د وطن
دا چې څرمنې ئې د نمر د تاو نه تورې ښکاري
دا چې مخونه ئې د زئړو زئړو پاڼو په شان
هم په د پاسه د حالاتو سپکې سپورې ښکاري

هم په لاسونو کښې تارونه په تارونو پورې
زاړۀ ډبي چې په کښې ژوند ته سپېلني لوګوي
دا په ظاهره سپېلني دي خو که سوچ په وشي
په حقيقت کښې خپله خپله زندګي لوګوي

الله دې لوي کړه زامنګيه ! زۀ چې تاته ګورم
نو ګورم تاته خو په خيال کښې ښار ته تلے يمه
په ښار کښې يو څو ماشومان په يو هوټل کښې وينم
هغو ته سوچ کوم هغو ته سوچ نيولے يمه

دا سوچ کوم چې دا به هم د چا نيازبين بچي وي
دا چې د نورو د پلارانو خدمتونه کوي
د څو کلدارو د حصول د پاره هر سړي ته
دا چې بې وخته او بې ځايه سلامونه کوي

او دا خیرن ، خچن ، پمن او بې ترتیبه بچي
دا چې د خدای په نامه یو بل ته اوبهٔ ورکوي
د خدای په نوم ئې چې ترڅو پیسې ګټلې نهٔ وي
ترهغې دوه وخته روټۍ هم ادې نهٔ ورکوي

او دا په تپلو کښې لړلي ککړمخي بچي
دا چې انړ استاذ قیصه په قیصه زور ورکوي
او دا واړهٔ کلینډران په ډاټسنونو پورې
چې ډرائیوران د رزق وخت په وخت پېغور ورکوي

الله دې لوي کړه زامنګیه ! زهٔ چې تاته ګورم
نو تاته ډېر خوبونه ووینم خو زړهٔ مې ډک شي
ځکه چې دا شډل بډل او بې عادته بچي
چې کله سپک شي نو ژړا راشي لېمهٔ مې ډک شي

دا سوچ مې واخلي چې د دوئي د زیږېدلو په وخت
ایا د دوئي د هر یو پلار به دا خوبونه نهٔ وي
دا چې زمونږ بچي چې لوي شي بیا دې لوي سړي شي
ایا د هر یو پلار به دغه ارمانونه نهٔ وي

له دې خوبونو به د هر یو پلار وي ډکې سترګې
خو دغه غېر خدائي تقسیم به موقعه نهٔ ورکوي
دا د انسان جوړ کړے شوے طبقاتي نظام به
نهٔ خو ژوندون نهٔ خو به حق د ژوندانهٔ ورکوي

دغسې حال دے خو اوس دې د پاره سوچ په کار دے
چې دا د ظلم طبقاتي نظام دې څنګه مات شي
د دې په ځاي دې کوم نظام د چا نظام قائم شي
چې جوړ د امن او د عدل توحيدي حالات شي

الله دې لوي کړه زامنګيه! لوي اقدام په کار دے
ځکه چې زمکې ته د لوي الله نظام په کار دے

شاہ محمود خان

غزل

لر یم او که بریم خلهٔ مې وچه ده
ټول پرهر پرهر یم خلهٔ مې وچه ده

خپلو له د هرې بربادۍ باعث
غېرو له سنګر یم خلهٔ مې وچه ده

دا په خپله خاوره اختیار نهٔ لرم
دا چې در په در یم خلهٔ مې وچه ده

ستا وعده په ځاے خو، د څو ورځو نه
وږے یم نهر یم خلهٔ مې وچه ده

تهٔ خو چې بچیه بهادر نهٔ شې
زهٔ چې بهادر یم خلهٔ مې وچه ده

ستا ګرېوان ته لاس مې در رسېږي نا
ځان سره په شر یم خلهٔ مې وچه ده

وخت وۀ چې ګل ومه، خو نن صبا
وران ویجاړ منظر یم خلۀ مې وچه ده

تۀ چې مرور شې خاندې دا ولې؟
زۀ چې مرور یم خلۀ مې وچه ده

ژوند له مې رنګین کړو مازدیګر، خپله
نمر د مازدیګر یم خلۀ مې وچه ده

زۀ دانش خوشحال یم خو په وچه خلۀ
زۀ د خوار اختر یم خلۀ مې وچه ده

شاہ محمود خان

غزل

په کار مې نۀ دي سپرلي هم چې فاصلې راولي
په اور پسې شه هر موسم چې فاصلې راولي

فطرت په هر څۀ کښې يو والے غواړي وپوهېدم
نور به د هغو نۀ منم چې فاصلې راولي

دويم ژوندون چې راکوي هم راته مه يادوئ
داسې دارو داسې ملهم چې فاصلې راولي

مرګي ته غاړه ورکوم خو چې يو والے راوړي
د داسې ژوند نه ځان ساتم چې فاصلې راولي

دعا ته لاس راسره پورته کړئ چې ماتې وخوري
څوک په اولاد کښې د ادم چې فاصلې راولي

زما خو داسې قيصه نۀ لګي د ژوند د پاره
زۀ خو په داسې قيصه مرم چې فاصلې راولي

نۀ خو منم د چا سور مخي سره داسې رحم
نۀ داسې فضل او کرم چې فاصلې راولي

تۀ په دروغ ببلتون ته خبر وائې خو زۀ دانش يم
ربښتيا دې هم دروغ ګڼم چې فاصلې راولي

بلوچی

- ترجمہ ۱۴۳
- غزل ۱۴۶

انتظار حسین
ترجمہ: عبدالحلیم عالم

دْراجیں کِسہ (لمباقصّہ)

آئیءَ گوں بھمانگیءَ منءَ چار اِت ءُ جُست کت "تو چوں سرپد بوت ئے؟" من گوْشت " بس من سرپد بوت آں بہ گوْش آکسہ چے اِنت؟ "

درّائینت ئِے "یارر چونھا آ منی ہم مکتبےءَ ءُ ما ہردُکاں یکّیں سبجیکٹ زُرتگ اِت آں ءُ گپ چداں بندات بوت۔۔۔۔ "

ثْران کنان آت ءُ ہاموش بوت گوْش ئے آئیءَ اے دمانءَ بازیں گپے یات پیداک آت۔ "یار تو نوں گپ در کتگ بلے کسہ دْراج اِنت تو بور بہ ئے۔"

اِنّاں من دل پہکیءَ گوں درّائینت۔ "تو بہ گوْش ئِے"۔

آ نوکی گپءَ بندات کنگءَ آت کہ اپتکار ءُ مزپر آتک آنت گوں آواں یک دگہ سنگتے گون آت۔ منءَ لھم لھمءَ گوْشت ئِے "اِدءَ ھبر نہ بیت وھدےءَ تھنا بہ ئے گُڑا گوْشان اِیں۔"

پدا اپتکار ون یونٹءَ گپءَ کپت۔ مزپرءَ گوْشت "ون یونٹءَ وَ پْرْوشگی آت۔"

"پرچہ پروْشگی آت ئِے؟" اپتکارءَ ثْرندیءَ گوں جُست کُت۔ آئیءَ اپتکار ءُ مزپر ھردو بئے نہ کت آنت ءُ ون یونٹءِ جیڈہءِ سرا جْوانیں تجزیہ ے دات ئِے گپ کجا چہ کجا سر بوت روس ءُ امریکہءَ داں پدا ویتنام ءُ چینءَ نوں بیگاہ بیگءَ آت

بلے آئیءَ دّرائینت کہ" منی گپ انگتءَ ناسرجم اِنت"۔

آئیءِ گپ مرچی ناں من بھہ سرجم بیگءَ نہ دیستگ۔ نوں اے مے ھمروچی اِیں آدت آت کہ کاراں گیشّین ءُ یک یک ءُ نیمءَ بْیا اے ریسٹورنٹءَ بہ

نند۔ اے زمستانی روچ اِت آنت ءُ اے ہوٹلءَ مزنیں پیژگاہے ہست آت کہ ما نِشتگءُ چاہ وارتگ پدا ملکاریءِ سرا ثْران کتگ۔

من باز رندءَ اپتکار ءُ مزپرءِ ساڈی نہ بیگءِ نپ زُرتگ ءُ ھما گپ چِست کتگ۔ آئیءَ چو مدامی وتءَ وجّ کتگ ءُ کسہ بندات کتگ پدا مزپر ءُ اپتکار رس اِتگ آنت۔ گپ میانءَ اوشتاتگ ءُ ھروھدءَ اے بیتگ کہ کسہ دْراج اِنت وھد رس اِیت تھنا نندیں ھبر کنیں۔

باز برءَ آ بیزار بوتگ ءُ گوْشتگ ےِئ " یارر اے چہ گپّے ما وتیگی گپّے ھم کت نہ کنیں مدام اپتکار ءُ مزپراں رُمبے رُمبے مردم گون کاینت پدا ھمروچیگیں ملکاری ءُ ھمروچیگیں گپ ءُ ثْران۔

بلے مدام چوْش بیت کہ آ وت گپءَ کپیت گوں ھبر کنت داں بیگاہ بہ بیت۔ من کہ گوْش آں رویں گوْشی تنیگءَ وَ منی رد ناسرجم اِنت۔ یک نیمروچےءَ آ سک گل آت ءُ آتک "بْیا کہ مرچی ما اِشانی پتہ کاٹ اِتگ آ تیوگیں رُمب شوْتگ ءُ سٹیڈیمءَ گُوازیءِ چارگءَ۔

باز وش! من ساہے زُرت۔ گوْشت ےِئ" ترا ھم وتی کِسہ گوْشگی اِنت۔

منءَ من ھبکہ بیت آں ءُ گوْشت۔

ھو ترا

ترا کئءَ گوْشت

انچو کہ تو منی کِسہءَ را سرپد بوت ےئ من ھم انچو سرپد بوت آں۔

یارر مے وَ کسہ سک کُوہن ترّاتگ۔

چْوشیں گپّے نہ اِنت۔ آئیءَ درّائینت "ھمے کِسہءَ ھم نوں دیر گُوستگ۔ من گوْشت شرّیں چاہے لوٹارین آں۔

چاہ ءِ گوْشت اوں، گُوازیءِ سکور جُست گِپت پدا گُوانکے ھتک ءُ آگوش کت چاہ ھم سر بوت من پہ ھردوکاں چاہ ایر ریتک۔

شر نوں وَ بہ گوْش

پہلیءِ دْروشمءَ گوْشت ےِئ "یارر کسہ دْراج اِنت"

چوْشیں گپّے نه اِنت به گوْش ۓِ۔

"هوں هاں۔" آئیءَ چاهءِ گُلمبے کِپت پدا جیڑّگءَ لگّ اِت آئیءَ چمّانی تها ڈْرپشناکی ۓِ ودی بوان بوت گوْش ۓ گپّے یات آهگءَ بوت آنت۔ گپّ یات آیاں بوت آنت ءُ ڈْرپشناکی ودّان بوت من آرا چاراں کت ءُ منءَ گوْستگیں هبر یات آیگءَ بوت آنت برے آئیءِ وشّیں توار برے وتی تْرندیں گپّے اِد ءُ اودءَ من هم هیال آں بُکّان بوت آنت۔ من گوں هاموشیءَ نِندوک اِتاں ءُ روچ مارا گِران آت۔

زمستانی روچ اجب تْرند بیت بندادتءَ وَ دلءَ وش کنت وهدے دیراں نِندئے گُڑا همے روچ ترا اداس کنت گوْش ۓ اداسی زمستانی روچ ءِ گوما ایر دیان کنت

هو یار ڇے به گوْش آں۔ آئیءَ په رنج گوْشت۔ پدا ما هردو هاموش بوتیں ءُ چاه وارت۔ پدا من گوْشت روچ تْرند بوت موسم مٹّ اِت .

هو موسم مٹّ اِت آئیءَ پسه دات۔ ما پدا هاموش آت اِیں ساهگ ٹهلان ٹهلاں میزءِ سرا ءُ میز ۓ سرا آتکگ آت پدا آئیءَ درّائینت "نوں رویں"

هو درکپگ لوٹ اِیت۔ ما هردو پادتکیں ءُ روگءَ آت اِیں آئیءَ درّائینت۔

تو ڇے گوْش ۓ ون یونٹءَ پڑوشگی آت یا مه پروْشتیں۔

من گُڑ ءُ منجءِ تها بوت آں۔ یار نه زاناں که پروْشگی آت ۓِ یا که اِنّاں۔ آ کمُکے روگءَ آت پدا گوْشت ۓِ "هو یارر نه زاناں۔"

ما پدا هاموشیءَ گوں روان بوتیں۔

عبدالحلیم

دستونک (غزل)

پگر آشوبی اِیں سسائے به ساچ آنت ءُ به ساچ آنت۔
تئی سِنچ ءُ تئی بود هست آنت ءُ به بات آنت هست۔

باهوٹ گدانی، بامردیں مزارءِ بیمّ منی پیروکی هسار آنت
بامردءِ سرءِ پاگ منی دود هست آنت ءُ به بات آنت هست۔

پیرزالےءِ کِسّو گوں کاپرءِ هینڑّکءَ هیالءِ اکسءَ ٹنگوک۔
هر کجا کْوهنگیں رود هست آنت ءُ به بات آنت هست۔

اے بشّی کوکرے دهکانءِ منی برووردءَ پُلیت ءُ وارت
دریاءَ تئی ساچ، تئی نود هست آنت ءُ به بات آنت هست۔

تئی بالادءِ همُک آزاء سینگارءِ بُت آں شودار کتگ بازارءَ
تئی امبازءِ دْروءَ اِیں تود هست آنت ءُ به بات آنت هست۔

سندھی

- مضمون ۱۴۹
- غزلیں ۱۶۶
- آزاد نظم ۱۷۰

محمد علی

شاھ عبداللطيف ڀٽائي جي باري ۾ بنيادي معلومات

حضرت شاھه عبداللطيف ڀٽائي رحه

شاھه صاحب جو جنم.

شاھ عبداللطيف ڀٽائي سنه ۱۶۸۹ع ۾ حيدرآباد ضلع جي ھالا تعلقي ۾، ھالا حويلي جي ڳوٺ ۾ ڄائو. شاھ عبداللطيف، سيد حبيب الله جو پُٽ، سيد عبدالقدوس شاھ جو پوٽو ۽ سيد جمال شاھه جو پڙپوٽو ھو. سيد جمال شاھ، شاھ عبدالڪريم بلڙيءَ واري جو ٽيون پُٽ ھو، شاھ تاجيءَ پيٽي سيد ھو. سندس والدھ به مخدوم دياني جي خاندان مان ھئي. مخدوم دياني جو مقبرو، پراڻن ھالن جي اُپرندي طرف آھي. شاھ جي ڄمڻ کان ٽورو ئي پوءِ، شاھ حبيب، ھالا حويليءَ مان لڏي، وڃي ڪوٽڙي ۾ رھيو. ھالا حويلي، پٽ کان نو ڪوھه پري آھي ۽ ڪوٽڙي ٻه ڪوھه.

شاھه جي تعليم ۽ تربيت

چون ٿا ته شاھه حبيب، پنھنجي پُٽ کي، وائي ڳوٺ جي مشھور عالم آخوند نور محمد ڀٽيءَ وٽ علم پرائڻ لاءِ موڪليو. وائيءَ جو ڳوٺ، پٽ کان ڇھه ۽ اُڏيري لعل کان ٻه ڪوھه پري آھي. چون ٿا ته شاھه "الف" اُچاري "ب" چوڻ کان نابري واري. شاھ صاحب اُمي (اڻ پڙھيل) ھو يا نه، تنھن بابت جدا جدا عالمن، جدا جدا رايا ڏنا آھن. ڪن صاحبن جو رايو آھي ته ھو ھڪ يگانو عالم ھو، ۽ ڪن صاحبن جو رايو آھي ته مٿس "علم لدني" نازل ٿيو ھو، جو ڏٺيءَ طرفان ڪامل ولين کي عطا ٿيندو آھي.

اکر پڑھ الف جو ورق ٻيا وسار
اندر تون اجار پنا پڑھندين ڪيترا

شاهه صاحب سان اڪثر ٿي ڪتاب همراه هوندا هئا: قرآن شريف، مولانا جلال الدين روميءَ جي مثنوي ۽ شاه عبدالڪريم بلڙيءَ واري جو رسالو. انهن ڪتابن تي ڪنهن به هنڌ ڪجهه لکيل ناهي، جنهن کي شاه جو دستخط چئجي. مير علي شير قانع ٺٽوي، جو شاه جو معتقد هو ۽ سندس ئي زماني ۾ رهندو هو، سو پنهنجي ڪتاب "تحفه الڪرام" ۾ لکي ٿو: "اگرچه حضرت شاه لطيف اڻ پڙهيل هو، ته به ساري عالم جو علم سندس دل جي لڪل تختيءَ تي لکيل هو" "تحفح الڪرام"، شاه صاحب جي وفات کان صرف سورنهن سال پوءِ، يعني ۱۷۶۸ ۾ لکيل آهي. انهيءَ ڪري ڪي عالم، هُن کي هڪ اهم سد ٿا سمجهن. حقيقت ۾ عارفن ۽ اوليائن جو ذڪر ڪندي، مير علي شير وڃي ڪرامتن ۽ معجزن جي عشق ۾ گرفتار ٿيو آهي. سندس دفتر مان ڪو خاص تاريخي يا شخصي احوال خير ٿو ملي.

شاهه جو عشق

روايت آهي ته شاهه ويهن ورهين جو هو ته ڪيس مجازي محبت جو ڪان لڳو. چون ٿا ته ڪوڙڙيءَ جي مرزا مغل بيگ جو شاهه حبيب ۾ ڪامل ويساهه هو ۽ ڪيس دعا ڦيٽي لاءِ اڪثر پنهنجي گهر ۾ وڃي ايندو هو. هو ارغون هو ۽ سندس گهر ۾ سخت پردو هوندو هو. سندس گهر ۾ اُگهائي ٿي پوندي هئي ته مرشد کي عرض ڪري دعا لاءِ وڃي ايندو هو. قضا سان، هڪ دفعي سندس نياڻي بي چاڪ ٿي پيئي. اتفاق سان، ساڳئي وقت شاهه حبيب جي طبيعت به ناساز هئي. انهيءَ ڪري مرزا بيگ جي عرض تي، پنهنجي پُٽ عبداللطيف کي ساڻس وڃڻ جي هدايت ڪيائين، شاهه، مغل جي دختر جو حسن ڏسندي بيخود ٿي ويو، ۽ سندس آڱر پنهنجي هٿ ۾ جهليندي، چيائين:

"جنهن جي چيچ سيد هٿ، تنهن کي لهر نڪو لوڏو."

اِهي سخن سڻي، مرزا ۽ سندس عزيز غصي ۾ لال ٿي ويا، پر ٻاهران صبر اختيار ڪيائون. اُن ڪانپوءِ اندران ئي اندران، سيدن کي به اهڙو ته تپائي کنيائون، جو هو لاچار ٿي، ڪوٽڙي ڇڏي، اُتر طرف ڪجهه مفاصلو پري، وڃي ڏار حويلي اُڏي وينا.

عشق جي ڪان لڳڻ ڪانپوءِ شاهه هرڻ ۽ هما وانگر، صحرائن ۽ بيابان ۾ سرگردن ۽ حيران ٿي پيو ڦرندو هو. هڪ دفعي ته ٿي ڏينهن ساندهه، هڪ هنڌ غش ئي عش پيو هو. سندس جسم تي واري جا تهه چڙهي ويا ۽ رڳو سندس هڪ ڪپڙي جو پلاند ٻاهر پئي ڏٺو. قضا سان، هڪ پنوهار جي وڃي مٿس نظر پيئي، جنهن سارو احوال وڃي شاهه حبيب کي سڻايو. شاهه حبيب اُڏامندو اچي انهيءَ هنڌ پهتو ۽ ڏاڍي سوز مان چيائين:

"لڳي لڳي واءُ، ويا انگڙا لٽجي"

شاهه بيخوديءَ جي حالت مان چرڪ پري اُٿيو ۽ ٿهه پهه جواب ۾ چيائين:

"پيئي ڪٽي پساهه، پسڻ ڪارڻ پرينءَ جي."

ڪي صاحب انهيءَ خيال جا آهن ته هن شعوري زماني ۾، اُهڙي روايت کي "ڏند ڪٽا" ڪري شمار ڪرڻ جڳائي ۽ اُنيءَ کان گريز يا ڪنارو ڪرڻ واجب آهي.

شاهه جو سير و سفر

هڪ ڏينهن، شاهه، اوچتو ئي اوچتو، بنا ڪنهن کي ٻڌائڻ چٽائڻ جي، جوڳين جي سنگ ۾، هنگلاج ڏانهن هليو ويو. ڏسجي ٿو ته هو ساڻن گنجي ٽڪر واري واٽ ئي ويو هو، ۽ سندن صحبت ۾ ٿي ورهين سفر ۽ سياحت ۾ رهيو. جوڳين جي صحبت ۾، جيءَ کي اٽيڪ جفائون ڏنائين، جهاني تجربا پرايائين ۽ املهه آتمڪ خزانا هٿ ڪيائين. هنگلاج ڏانهن ويندي جيڪي هنڌ ۽ مڪان ڏٺائين، تن جو ذڪر سسئيءَ وارن سرن، سرڪاهوڙي، سر رامڪلي وغيره ۾ ڪيو اٿس. هنگلاج کان موٽندي، شايد ٽٽي کان

سنڌونديءَ وارو پٽڻ اُڪري، مغليين، لکپت، هالار، دواراڪا، پوربندر، جهونا ڳڙهه، گرنار ۽ ڪنيات گهميو آهي. چون ٿا ته ٺٽي ۾ مخدوم معين ۽ ٻين عالمن فاضلن سان به رهاڻيون ڪيائين. مخدوم معين کي ”مخدوم تارو“ به چوندا هئا. وطن ڏانهن ورندي، جيسلمير ۽ ٿر به گهمندو آيو ٿو ڏسجي. ”سرمارئي“ ۾ ٿر جي نظارن ۽ ٿرين جي زندگيءَ جو اکين ڏٺو احوال ڏنو اٿس. ممڪن آهي ته جيسلمير کان پنج ڪوهه پري، لداڻو ٽڪري ۽ ان سان لڳل ڪاڪ ڪنڌي به ڏسي آيو هجي. ”سر مومل راڻو“ اهڙي شاهدي ڏئي ٿو.

ساري ڏج، سيد چني لداڻي تان لاهه

لنگر ٺٽي ڏانهن ورندي، هڪ غار ۾ هڪ شخص کي ڏٺائين، ته هيءَ مصرع، نهايت دردناڪ نوع ۾ پيو چوي:

هيڪلياڻي هيل، پورينديس پنهونءَ ڏي.

پڇڻ تي معلوم ٿيس ته هو هڪ جت هو، ۽ هالن جي پرسان لنگهندي، فقيرن جي واتان اها مصرع ٻڌي هيائين. شاهه چيس ته ”جي چاهين ته بيت جون باقي ٻه مصراعون به سڻايان،“ اُنهيءَ تي، جت خوشي ڏيکاري، شاهه تنهن تي ٻي مصرع چئي ٻڌايس:

اُڏا ڏونگر لڪايون، سوريون سڄڻ سيل:

ٻي مصرع ٻڌندي ئي، جت وجد ۾ اچي ويو، ٽي مصرع ٻڌڻ لاءِ بيتاب ٿيو، جنهن تي شاهه ٽي مصرع چئي ٻڌايس:

ته ڪر ٻيلي آهن ٻيل، جي سور پريان جا ساڻ مون

شاهه جو بيت ختم ڪرڻ تي جت جو فوت ٿيڻ. شاهه جي ارمان ۽ عجب جي حد نه رهي. پوءِ جت کي اُتي دفن ڪيائين. اُنهيءَ جت جي قبر اڃان تائين واٽهڙن کي ڏسڻ ۾ ايندي آهي. شاهه اڪثر چوندو هو ته، ”انهيءَ جت جهڙو درد وارو انسان، مون ڪڏهن ڪونه ڏٺو.“

شاهه حبيب، پُٽ جي فراق ۾ بيهال ٿي پيو هو، ۽ رات ڏينهن، پيو ڏٽيءَ در باڏائيندو هو، ته سندس پُٽ ڪيس وري سلامت اچي ملي.

مخدوم نوح جي درگاهه تي به، هر روز اها ئي دعا پنندو هو. هڪ ڏينهن اوچتو ئي اوچتو، شاهه عبداللطيف اچي پنهنجي گهر سهڙيو. پيءُ جون اکيون ٺري پيئون؛ ورهين جو وڇوڙو هڪ لحظي ۾ لهي ويو.

شاهه جي شادي

شاهه جي گهر موٽي اچڻ ڪانپوءِ ستت ئي پوءِ مٿس شادي جو ٻنڌڻ پيو. جنهن جي ڪارڻ، گهڻو وقت بيتاب ٿي، جهنگ واديون ۽ رڻ ڦريو هو، تنهن سان ئي قدرت سندس ناتو جوڙيو. اُها هئي مرزا مغل بيگ جي نياڻي، بي بي سيده بيگم، جنهن کي شاهه صاحب جا مُريد، پوءِ ادب وچان، تاج المخدرات (ستين جو چٽ) سڏيندا هئا.

شاهه جي شادي ڪيئن ٿي، سا به هڪ حيرت جهڙي ڳالهه آهي. هڪ ڏينهن، اتفاق سان ائين ٿيو جو ڪي دل ذات جا رهزن، مردن جي غير حاضري جو فائدو وٺي، مرزا مغل بيگ جي گهر تي ڪاهي آيا، سارو قيمتي مال ٻهاري رمندا رهيا. پوءِ مغل هٿياربند ماڻهون ساڻ ڪري، ڌاڙيلن جي ڪڏ لڳا، ۽ اچي شاهه جي پاڙي مان لانگهاڻو ٿيا. اها روئداد ڏسي، شاهه سچي نيت سان، پنهنجون ۽ پنهنجن ماڻهن جو خذمتون آڇين، پر مرزا، ان کي حقارت سان ٺوڪاري ڇڏيو. شاهه کي انهيءَ تان ڏاڍو رنج رسيو. چون ٿا ته سندس زبان مان بي اختياري بددعا نڪري ويئي. مرزا پنهنجن ماڻهن سميت شاهينگن هٿان مارجي ويو. اهو حادثو ١١٢٣ هجري مطابق سنه ١٨١٣ع ۾ ٿيو. مغلن جي زالن، سيدن جي رنج مٽائڻ لاءِ، اچي ڪائن معافي ورتي، پوءِ مرزا مغل بيگ جي نياڻيءَ جي شادي، شاهه سان ڪرايائون. بيبي صاحبه هڪ نهايت پاڪدامن، پارسا ۽ نيڪ اطوار عورت هئي. شيخ سعديءَ جو فرمودو آهي:

زن نيڪ وففرزائجه وپارسا. ڪند مرد درويش را پادشا

معني نيڪ، سياڻي ۽ پارسا عورت، فقير مرد کي به بادشاهه بڻائي ٿي ڇڏي. هن جي سڳوريءَ صحبت، جي شاهه کي هڪ روحاني سلطان بڻائي ڇڏيو

ته کهڙو عجب!

هوءَ پاڻ سان پنهنجو ننڍو ياءُ گولو وٺي آئِ هئي، جو جلدئي گذاري ويو.

شاهه جو اولاد

شاهه کي ڪو اولاد ڪونه ٿيو. چون ٿا ته بيبي صاحبه کي هڪوار اُميد واري ٿي هئي، پر پوءِ ڪهياءِ ٿي پيس. انهيءَ جو ڪارڻ، هن ريت ڄاڻايل آهي:

هڪ ڏينهن شاهه پنهنجي هڪ فقير کي، پري کان سهڪندو ايندو ڏٺو، پڇڻ تي معلوم ٿيس ته بيبي صاحبه کي پلي تي دل ٿي هئي، ۽ اهو فقير، ڊوڙي وڃي گهٽي پنڌ تان پلو هٿ ڪري آيو هو. اهو حال ڏسي، شاهه چيو ته ”اهڙو اولاد ئي گهوريو، جو جمڻ کان اڳي ئي منهنجي فقيرن کي ٿو رلائي.“

شاهه هميشه چوندو هو ته، ”هي فقير ئي منهنجو اولاد آهن، جن جون دليون عشق کان گهايل آهن.“ تحقيق درويش جا مُريد سندن نوري پُٽ آهن.

شاهه جي عبادت ۽ رياضت

هاڻي شاهه جي زندگي هموارءَ موزون نموني ۾ گذرڻ لڳي. شاهه صاحب سمورو وقت، رياضت، عبادت، شعر گوئي ۽ قدرت جي جمال پسڻ ۾ صرف ڪندو هو. قدرت جا من موهيندڙ نظارا، کيس وجد ۾ آڻي ڇڏيندا هئا. اڪثر اونهي ويچار ۾ گذاريندو هو ۽ ”انسان ڇا آهي؟ عالم ڇا آهي؟ حق ڇا آهي؟“ جي باريڪ مسئلن تي غور ڪندو هو. تصوف ۾ به انهن ئي باريڪ نڪتن تي ويچار آيل آهن: ”انسان، جهان ۽ خدا ڇا آهن؟“

شاهه جي باجهاري طبيعت، نيڪ اطوارن ۽ پاڪدامنيءَ ڪيترن ئي انسانن کي مٿس مفتون ڪري ڇڏيو. هڪ هو اڳيئي سيد، ٻيو سياءَ جو هو سياجهو، سو ته ويتر ماڻهن کي موهي وڌائين. شاهه پاڻ پوڄائڻ کان پري هو، ۽ پيري شيخي، دل کي نه وڻندي هيس:

پوڇا ڪر پاڻ ڪي، جوڳي! رکج جوڳ،
خلق خادم جئن ڪرين، اي راول! وڏو روڳ.

پر خلق خود ڏانهنس ڇڪجي ٿي آئي. ماڻهن وٽ شاھ جي ايڏي عزت، آسپاس جي پيرن ۽ ميرن کان سٺي ٿي ويئي، مطلب ته سمورو حسد، پيريءَ مخدوميءَ تان هو: شاهہ ذاتيءَ طرح پاڻ به ان جي خلاف هو. پر جن جي اکين ۾ موريسر سي ڪئن سچ ڏسن! سيني پنهنجي پرِ ۾، کيس تنگ ۽ پريشان ڪرڻ سان گهٽايو ڪين؛ بلڪ، ميان نور محمد ته کيس صفحه هستيءَ تان اُڏائڻ جي به ڪوشش ڪئي، پر شاھ جا مڙيئي دشمن، کيس ذرو به ضرر رسائي نه سگهيا.

شاهه ۽ ميان نور محمد ڪلهوڙو

شاھ کي اچي خيال ٿيو ته شاهه عبدالڪريم جو مقبرو جوڙايان، سو ڪاشيءَ جي سرن آڻڻ ڪاڻ، ملتان ڪهي ويو، موٽندي جڏهن خداباد ۾ پهتو، تڏهين ڪئين ماڻهو سندس قدمبوسيءَ لاءِ آيا، ميان نور محمد ڪلهوڙي، هڪ معجون جي دٻلي نذراني طور ڏياري موڪليس، شاهہ دٻلي وٺندي ئي، درياهه ۾ اڇلي ڇڏي ۽ چيائين ته "پل ته سارو عميق، هن معجون جو فيض وٺي." معجون ۾ زهر قاتل ملايل هو. چون ٿا ته پاڻيءَ مٿان اوڏي مهل ئي مئل مڇيون ترنديون نظر آيون. ٻئي دفعي وري دعوت ڏيئي، هڪ سرڪش گهوڙي، سونن سنجن سان سينگاريل، تحفي طور ڏنائيندس. شاهہ لغام کي پري اُڇلي، گهوڙيءَ کي اڙي هٽي، اتان طوفان جيان نڪري ويو، ۽ ٿوري وقت ڪانپوءِ، صحيح و سلامت ساڳئي منزل تي موٽي آيو. ميان نور محمد ڪلهوڙو پنهنجي ڪئي تي ڏاڍو پشيمان ٿيو، ۽ دشمن مان ڦري، سندس معتقد ٿي پيو، چون ٿا ته ميان نور محمد کي، ميان غلام شاهه ڪلهوڙو، شاهه جي دعا سان ڄائو.

شاهه جي پٽ وسائڻ

شاهه کي هاڻي خلوت جي عشق، ڪوٺڙيءَ ۾ آرام نه ڏنو. پنهنجي سير جي دوران ۾، نون هالن کان پڻ ڪوهن جي مفاصلي تي، ڪراڙ ڍنڍ نزديڪ، هڪ ڍبن ۽ ڍبين جي وچ ۾ بيٺل، ۽ ڪرڙن ۽ ڪنڊن ۾ ويڙهيل، واريءَ جو دڙو چتائي چڏيو هيائين. سندس نظر ۾، اهو سيهرو، عبادت لاءِ هڪ آدرشي آستان هو. نهايت ڪشالي ۽ محنت سان ان کي پنهنجي محبوب "پٽ" جي صورت ڏنائين. فقيرن سان گڏ انهيءَ واريءَ جي دڙي مٿان چيڪي مٽي وڌائين، ۽ پوءِ پنهنجي لاءِ هڪ جهوپڙو اڏيائين. هڪ ننڍڙي مسجد ۽ پنهنجي اَبي ۽ اَمڙ لاءِ هڪ حويلي به اڏرايائين، ۽ فقيرن کي به رهڻ لاءِ حدون مقرر ڪري ڏنائين. مينهن جي موسم ۾، پٽ، هڪ رونقدار ويس پهريندي هئي. شاهه "سر سارنگ" ۾ اُن رونق ڏانهن ڪي اشارا فرمايا آهن.

چون ٿا ته شاهه عبدالڪريم، هڪ لڳا انهيءَ هنڌان لنگهندي، اتي، نماز پڙهي هئي ۽ پڻ فرمايو هئائين ته "اسان جي اولاد مان هڪ ولي ۽ وڏو شاعر هن هنڌ پنهنجو آستانو جوڙيندو." اُن وقت شاه عبدالڪريم، هالن واري مخدوم نوح کي ملڻ لاءِ وڃي رهيو هو، ڇو ته مخدوم صاحب ۽ شاهه عبدالڪريم پاڻ ۾ گهرا دوست هوندا هئا.

شاهه حبيب جو بيمار ٿيڻ ۽ وفات

شاهه اڃان پٽ کي تيار ڪرڻ جي ڪم ۾ ئي لڳل هو ته پنهنجي والد سڳوري جي سخت بيماري جي خبر مليس. شاهه حبيب قاصد هٿان پٽ ڏانهن هي نياپو ڏياري موڪليو:

> ڪنهن جنهن نينهن ننڍاءِ، جي مون واجهائيندي نه ورو،
> جيڪي مئي ڪنداهه سو جانب ڪريو جيئري.

شاهه پنهنجي والد کي گڏجڻ لاءِ بيحد بيتاب ٿيو ۽ قاصد کي جوا ۾ هي بيت ڏنائين:

متان ٽئين ملوڙ ڪين اڳاهون آهيان
ڏسڻ ۾ ڪر دوڙ حد ٻنهيءَ جي هيڪڙي.

شاهه حبيب ڪي پٽ جو نياپو مليو ته اندر ڪي آرام اچي ويس. شاهه نياپي موڪلڻ کان ترت ئي پوءِ پنهنجي والد سڳوري ڪي ملڻ لاءِ روانو ٿيو. اَفسوس جو سندس پهچڻ کان اڳيئي شاهه حبيب جو روح وڃي حق سان هِڪ ٿيو. پيءُ جي وفات ڪري شاهه ڪي ڏاڍو ڏک ٿيو ۽ هو ڪيترا ڏينهن ماتم ۾ رهيو.

شاهه حبيب جي وفات کان پوءِ ڪيس شاهه جي هدايت موجب محمود فقير جي سيرانديءَ کان دفن ڪيائون. هاڻي مقبري مٿان گنبد ٺهيل آهي. اِهو گنبد شاهه صاحب جي مقبري کان اُتر طرف اٺن نون وکن جي مفاصلي آهي. شاهه حبيب سن ١٧٤٢ع ۾ وفات ڪئي. اها تاريخ محمد صادق نقشبنديءَ جي عربي مصرع مان نڪري ٿي: ”اَلموت جسر يوصل الحبيب لِيٰ لقاءَ الحبيب“ يعني موت هڪ پُلِ آهي، جنهن تان هڪ دوست لنگهي وڃي ٻئي دوست کي ملي ٿو.

شاهه جا آخري ڏينهن ۽ وفات

شاهه صاحب، پيءُ جي وفات کان پوءِ رڳو ڏهه ورهيه زنده رهيو. پيءُ جي گذرئي کان پوءِ اٽالي سميت، ڪوٺڙي ڇڏي، وڃي ڀٽ تي رهيو. سندس هاڪ، هينئر هنڌين ماڳين پکڙجي ويئي، ۽ ڪٿان ڪٿان جا ماڻهو، سندس ديدار لاءِ آيا ٿي.

وٽس سارو ڏينهن سرود ۽ سماع جاري رهندو هو. دهليءَ جا ٻه مشهور گويا، اَٽل ۽ چنچل ٻه، اَچي سندس خدمت ۾ حاضر ٿيا. راڳ، شاهه صاحب جي جان هو. موسيقي سا ڳائڪيءَ جو ڪامل ڄاڻو هو. پاڻ ٻه پنهنجو چيل ڪلام ڳائيندو هو. چون ٿا ته وفات کان ٿورو اڳ، گهڻو ڪري هيٺين ڪافي چوندو رهندو هو. اِها ڪافي ”سر سهڻي“ جي پهرئين داستان کان پوءِ

اَچي ٿي.

ڪهڙي منجهه حساب؟ هئڻ منهنجو هوت ري، لا....

حياتيءَ جي پڇاڙيءَ ۾ اچي سڪ ٿيس ته ڪربلا شريف جي زيارت ڪري اَچان. قضا سان واٽ ۾ هڪ خدا رسيدو مريد گڏيس، جنهن چيس ته "سائين سڳورا! اوهين ماڻهن کي چوندا آهيو ته اوهان جو ڪفن دفن پٽ تي ٿيندو، پوءِ هينئر ڪيئن پڇاڙيءَ جي وقت هيڏي سفر تي نڪتا آهيو؟" شاهه جي دل ۾ اِهي سخن تير مثل پيهي ويا، ۽ هو ڪربلا جي زيارت جو خيال ترڪ ڪري، پٽ ڏانهن واپس وريو. پٽ تي پهچڻ سان، ڪارو ويس ڪري، اَمامن جي ماتم ۾ "سر ڪيڏارو" چيائين. پورا ايڪيهه ڏينهن اڪيلائپ ۾ رهيو، ۽ اُنهيءَ عرصي ۾، ٻن ويلن جيتري ماني مس کاڌائين. جڏهين ٻاهر نڪتو، تڏهين غسل ڪري هڪ چادر مٿان وجهي، مراقبي ۾ ويهي رهيو. پوءِ سرود ۽ سماع جو اِشارو فرمايائين. ٽي ڏينهن برابر فقيرن جو راڳ روپ پئي هليو. آخر راڳ ختم ٿيو، پوءِ شاهه جي ويجهو چا وڃي ڏسن ته سندس روح مبارڪ پرواز ڪري، وڃي رب سان مليو هو!

شاهه صاحب صفر مهيني جي چوڏهين تاريخ سنه ۱۱۶۵هه مطابق ۱۷۵۲ع ۾ جهان مان لاڏاڻو ڪيو. سندس عمر، غضرت محمد ﷺ ۽ حضرت عليءَ جي عمر جيتري ٿي، يعني ۶۳ ورهيه.

شاهه صاحب جو لاش مبارڪ، سندس وصيت موجب، پٽ تي، محمود شاهه جي پيرانديءَ کان دفن ڪيو ويو. ميان غلام شاهه ڪلهوڙي پنهنجي خرچ سان، سندس تربت مٿان سنه ۱۷۵۴ع ۾، هڪ عاليشان مقبرو، وقت جي ناميارى عيدن رازي کان جوڙائي راس ڪرايو. ميرن جي صاحبيءَ ۾ مير نصير خان، انهيءَ مقبري ۾ مسجد جي عمدي مرمت ڪرائي. سنس سوٽ مير محمد خان، قبي کي چانديءَ جو دروازو وجهايو، جو اڄ تائين قائم آهي. دروازي مٿان، توڙي ديوارن تي، ڪيترائي سهڻا فارسي بيت نقش ڪيل آهن، جن مان

شاهه صاحب جي وفات جي تاريخ ملي ٿي.

شاهه صاحب جي تربت سڳوري، هينئر عام و خاص لاءِ هڪ زيارتگاهه آهي. اُن جو ديدار، قلب کي آرام ڏيندڙ آهي.

ساري رات سبحان، جاڳي جن ياد ڪيو،
اُن جي عبداللطيف چئي، مٿيءَ لٿو مان،
ڪوڙيين ڪن سلام، اَڳهه اَچيو اُن جي.

هر جمع رات، ڀٽ شريف تي، فقير، شاهه صاحب جو ڪلام ڳائيندا آهن. ڪلام رات جو ڏهين بجي ڌاري شروع ٿيندو آهي، ۽ صاف صبوح تائين هلندو آهي.

شاهه جي رسالي جو جنم

"شاهه جو رسالي" ۾ ڪلام، وجد واري حالت ۾ چيل آهي. شاهه صاحب جڏهين انهيءَ حالت ۾ ايندو هو، تڏهين ويندو هو شعر چوندو، جي سندس فقير بروقت قلم بند ڪندا ويندا هئا. هڪ روايت آهي ته وفات کان ٿورو وقت اڳ، سارو رسالو ڪراڙ ڍنڍ ۾ داخل ڪري ڇڏيائين، ڇو ته اهو خيال اچي ٿيس ته متان ماڻهو سندس رمزون نه سمجهي، وڃي گمراهيءَ ۾ پون. چون ٿا ته شاهه جي ائين ڪرڻ تي، فقيرن کي ماتم وٺي ويو، ۽ پاڻ مٿن رحم آڻي، هڪ مريدياڻي، مائي نيامت (نعمت) کي فرمايائين ته فقيرن کي اُهو لکارائي ڇڏي. چون ٿا ته انهيءَ مائيءَ کي شاهه جي ڪلام جو گهڻو حصو ياد هو. پوءِ انهيءَ نئين سر تيار ٿيل رسالي کي "گنج" ۱ ڪري سڏيائون ۽ تمر فقير جي حفاظت ۾ ڇڏيائون. فقير جا پويان اڃا تائين اُن جي حفاظت ڪندا ٿا اچن.

شاهه جي صورت ۽ سيرت

شاهه صاحب جو ڪلام، سندس سيرت جو آئينو آهي. جن گڻن کي پنهنجي ڪلام ۾ واکاڻيو اٿس، تن مڙني جو مجسم هو. سندس مٿو هو هر حال ۾ تواضع ۽ خاڪساري ڪرڻ ۽ "سيني سين، من ماري ميڻ ڪرڻ"

جيڪي خاڪ ۾ ڏٺائين، سو عالم جي ٻي ڪنهن به شيءِ ۾ نه ڏٺائين:

سو نه ڪنهن شي ۾، جيڪي منجهه تراب

شاھ صاحب جي وات، نيستيءَ واري هئي، نه هستيءَ واري. نيستيءَ ۾ هستي ۽ نابوديءَ ۾ بود ڏٺائين.

شاھ صاحب کائيندو پيئندو ۽ پهريندو سادو هو. اِلاهي محبت ۾ رڱيلن جي، نه ڪڏهين پوشاڪ سان پيئي آهي، نه خوراڪ سان. شاھ صاحب جي، ظاهري لباس، سينڌ سرمي ۽ ٺاهه ٺوهه سان نه پوندي هئي.

شاھ صاحب جي پوشاڪ، ڪاري ڏاڪي سان سبيل هڪ گيڙوءَ رتي ڪفني هوندي هئي. مٿي تي سفيد رنگ جي وڏي ٽوپي يا ڪلاهه ۽ اُن جي مٿان ڪاري رنگ جي ڪپڙي جو ٽڪر ويڙهيل هوندو هوس. هٿ ۾ جوڳين جي بيراڳڻ جهڙي لٺ ڪٺندو هو. ڪاڏي پيتي لاءِ هڪ ڪشتو يا ڪشڪول هوندو هوس. اُهي شيون اَجا تائين ڀٽ شريف تي پوري حفاظت ۽ اَحترام سان سانديل آهن. پور پوندو هوس ته جتي پائيندو هو، نه ته پيرين اُگهاڙو پنڌ ڪندو هو. اوچي بستري تي نه، پر هڪ پراٽيءَ ڪٿائين گودڙيءَ تي سمهندو هو. ڪڏهين به ڪنهن دنيوي فرحت کي اوڏو نه ويو. ننڊ به نهايت ٿوري ڪندو هو. جهڙيون رياضتون شاھ صاحب ڪيون، تهڙيون ڪنهن ورلي ڪيون هونديون. سمهندو به هڪ صندل تي هو، جو اَجا تائين موجود آهي.

شاھ لاطمع به هڪڙو ئي هو. ڪڏهين به ڪ نهن جو ٿورو کڻڻ نه چاهيندو هو. پاڻي به پنهنجن هٿن سان ڀري پيئندو هو، ڇو جو ڪنهن کي پاڻي آڻڻ لاءِ چوڻ به، سندس خيال ۾ سوال ۾ داخل هو.

چون ٿا سندس هڪ مريد، هر سال جڏهين سندس زيارت لاءِ ايندو هو، تڏهين هڪ ڪٽو ڀاڄ سان نذراني طور آڻيندو هو. هڪ سال، مسڪينيءَ سببان، ويچارو ڪٽو ڳنهي نه سگهيو، تنهنڪري شاھ صاحب وٽ لڄ وچان آيو ئي ڪين. ٻئي سال، دستور موجب ڪٽو ڪٺي، شاھ صاحب وٽ آيو. شاھ

صاحب پڇيس ته ”پر سال ڇو نه منهن ڏيکاريءِ؟“ جواب ڏنائين ته ”پر سال توفيق نه هيم جو سائين جن لاءِ ڪتو ڳنهي ڪٽي اچان: ڇيم ته هٿين سڪٽو ڪيئن اچان.“ اِنهيءَ تي شاهه صاحب فرمايو ته ”اُهو ڪتو ئي گهوريو، جو دوست کي دوست کان دور ڪري.“

شاهه اعليٰ انسانيت جو مثال

شاهه صاحب جو قلب نهايت ڪومل هو. نه رڳو اِنسان ذات لاءِ، پر پکين ۽ پسن سان اٿاهه قرب هوس. حياتيءَ ۾ ڪڏهين پلئي پلائي به، ڪنهن پکيءَ پرندي ۽ پسونءَ کي ڪو ڏک نه رسيائين. شڪارين کي اجل جي ياد ڏياري، جئن ويچارن گگدامن کي مارڻ کان باز اچن. (اِهو عام انسانن لاءِ به هڪ هدايت آهي.)

شڪار تون شهباز جو، تون تان منجهه شڪار!

ڪونجڙين کي شڪار ٿيندو ڏسي، سندس دل درد کان رجيو ٿي وڃي. اُنهن معصومڙين جي دل مان به ڇڻ پيهي نڪتو هو. ماريءَ جي چار ۾ ڦاسڻ وقت، اندر ۾ اُهو ئي وڍ پيو پوين، ته سندن پٽيان، سندن ٻچا ڪيئن ڪندا.

ڪونجيون ٿيون ڪٽڪن، جيڪي هلڻ هاريون،
ٻچا پوءِ اُتن، وڃن وانڌا ڪنديون.

ڪونجڙين کي اندر ۾ وڍ پوندا ڏسي، سندس اندر جا به چاڪ ٿي چڪيا. اُنهن جي درد وارين دانهن، سندس فراق جا ڦٽ آلا ٿي ڪيا:

ڪونجڙي ڪالهه لنئين، سڄڻ وڏم چت،
آئون جنهن ريءَ هت، گهنگهر گهاريان ڏينهنڙا.

دل ايتري قدر ته نرم هيس، جو ڪهل وچان، ٻن ڪتن کي پنهنجن هٿن سان پاليو هيائين، ڇو ته اُنهن جي ماءُ ڪين ننڍڙڪي حالت ۾ ڇڏي ويئي هئي. اُنهن مان هڪ کي ”موتي“ ۽ ٻئي کي ”ڪينهو“ ڪري سڏيندا هئا.

شاهه صاحب نهايت پرهيزگار ۽ پاڪدامن هو. مجازي عشق ڪمايائين،

پر اُن ۾ اَٽڪي بيهي نه رهيو. شاديءَ کان پوءِ پنهنجي ڏاڏيءَ شاهه عبدالڪريم وانگر، چڙائيءَ جي واڪاڻ ڪندو هو.

راڳ تي ايتري قدر ته مفتون هو، جو وصال به راڳ ٻڌندي ڪيائين. سارو وقت وٽس سرود ۽ سماع لڳو ئي پيو هوندو هو. سماع هلنديءَ، سر جي به سمڪ نه هوندي هيس. تندن جي تانن ۾ روحاني راز پروڙيائين.

تان نه آهي تند جو، رون رون ڪري راز.

راڳ جو سچو قدر ”سر سورٺ“ ۾ ڪيو اٿس. راڳ جي عشق جي لحاظ کان، راءِ ڏياچ، شاهه پاڻ آهي.

شاهه جا صحبتي

شاهه صاحب وڏي ڏيا ۽ حشمت جو صاحب هو. سندس حضوريءَ ۾ ڪنهن کي به ڪا گستاخي ڪرڻ جي مجال نه هئي. هميشه ڳورو ۽ ڳنڀير گذاريندو هو. اَلبت، ”وڳند“ يا ”ورو فقير“ سان، وقتي چرچا ڀڳا ڪندو هو. ”سر بلاول“ ۾ اِنهيءَ ”جسم ۾ جڏي“ فقير سان چڱو مذاق ڪيو اٿس. شاهه صاحب جي هن جڏڙي سان اهڙي ڪا خاطر هئي، جو هن جي صدقي، ظريفانو شعر به چيو اٿس. وڳند کي گهڻن ئي مذاقي لفظن سان ياد فرمايو اٿس: ”بدو“، ”نسوروئي نرڳ“، ”بي نماز“، ”ڪلاٺ“، ”نرڳي“. هن جي گدلائيءَ ۽ پيٽوڙپائپ تي چڱائي چرچا گهڻا ڪيا اٿس. اِهو فقير ڪوٽڙيءَ جو ئي هو. ٻيا فقير، جي شاهه صاحب جي مريدن ۾ داخل هئا، سي هئا: تمر فقير، سندس خاص خليفو، جنهنجو اولاد اَڄ ڏينهن تائين سندس درگاهه ۾ مجاور آهي: محمود شاهه جو اَميري ترڪ ڪري فقير ٿيو هو، ۽ جنهن لاءِ شاهه صاحب کي ايڏي عزت هئي، جو پنهنجي تربت، هن جي پيرانديءَ کان ڪرڻ جي وصيت ڪئي هئائين: شاهه عنايت، هڪ وڏي زميندار جو پٽ، ميون هاشم علوي ريحان پوٽو، جو راڳيندڙ به هو ۽ لکپڙهه جو ڪم به ڪندو هو: ۽ بلال، جنهن سان ايڏي محبت هيس، جو ڪڏهين ڪڏهين هن جي ملاقات لاءِ هن جي ڳوٺ

ڪهي ويندو هو.

شاھ ڪي ڪامل درويش سان رهاڻين ۽ ملاقاتون ڪرڻ جو شوق هو ۽ اڪثر پاڻ وٽن ڪهي ويندو هو. شاھ جي زماني ۾ سنڌ ۾ گهٽيئي ڪامل فقير هئا. شاھ صاحب پنهنجي حياتيءَ جي عرصي ۾ گهٽن ئي الله لوڪن سان ملاقاتون ۽ رهاڻيون ڪيون. ڦوهه جوانيءَ جي زماني ۾ شاھ عنايت جهوڪ واري سان ملاقات ڪيائين. چون ٿا ته شاھ عنايت ڪيس ڏسندي ئي هيٺيون بيت چيو، اُن ۾ سالڪ کي طريقت جي واٽ وارين مشڪلاتن جو شير دليءَ سان مقابلو ڪرڻ بابت هدايت فرمايل آهي:

ڏسي ڏونگر ڏار، متان هلڻ ۾ هيٺي ٽئين،
ڪي مجازاڻيون موٽيون، سڻي پنڌ پچار،
پويون پائج پرينءَ کي، حقيقت جو هار،
سِگهي لهندءِ سار، آريچا عنايت چئي.

شاھ صاحب جواب ۾ هيٺيون بيت فرمايو:

پسي ڏونگر ڏاھ! جم هلڻ ۾ هيٺي وهين،
لانچي لڪ، لطيف چئي، پٽيءَ ڪيچين ڪاھ،
پچي پورج، سسئي! بلوچاڻي باھ،
اِن وڙائتي ور جي، آسر هڏ م لاھ،
جو اڪنئون اوڏو اھ سو پرين پرانهون م چئو.

شاھ عنايت جي شهادت وقت، شاھ ۳۱ سالن جو هو. خواجه محمد زمان لواريءَ جي ملاقات لاءِ به پاڻ ڪهي ويو هو، جيتوڻيڪ عمر جي لحاظ کان، خواجه صاحب، شاھ صاحب کان گهڻو ننڍو هو. شاھ صاحب خواجه صاحب جي ڪمالیت کان اَهڙو ته متاثر ٿيو هو، جو جڏهين به وٽس هن صاحب جو ذڪر نڪرندو هو، تڏهين ازخود زبان مان هي بيت ڇٽڪي نڪرندو هوس:

مون سي ڏٺا ماڻھ، جنين ڏٺو پرينءَ کي،
ڪري نه سگهان ڪاءِ، اُئين سندي ڳالڙي.

شاهه صاحب، مخدوم محمد معين، ٺٽي جي مشهور عارف وٽ، گھڻو ايندو ويندو هو.

مخدوم صاحب، جو "اويسيه" نالي رسالو لکيو، سو به شاهه صاحب جي اِستدعا تي، ڇو جو شاهه صاحب جو، اويسي طريقي سان خاص پيوند هو. بلڪ اِئين چئجي، ته شاهه صاحب پاڻ هڪ اويسي عارف هو. شاهه صاحب جي مرشد جي ڪل، ڪنهن کي به نه رهي آهي: هو صاحب، رياضتن ۽ ڪشالن جي ذريعي ئي، روحاني ڪماليت کي رسيو.

"تحفته الڪرام" ۾ آيل آهي ته جڏهين مخدوم صاحب جي وفات جو وقت ويجهو آيو، تڏهين شاهه صاحب پنهنجن فقيرن کي فرمايو ته، "هلو ته پنهنجي دوست سان پڇاڙيءَ جي ملاقات ڪري اَچون." فقيرن اُتي پهچي، سماع شروع ڪيو. مخدوم صاحب تي سماع جو ايڏو ته اثر ٿيو، جو هو ذوق ۽ حال ۾ اَچي، پنهنجي حجري ۾ هليو ويو، ۽ ساعت ڪان پوءِ سندس روح وڃي حق سان هِڪ ٿيو.

شاهه صاحب جي، سچل فقير جي ڏاڏي ميان صاحبڏني سان به ملاقات ٿي. هن صاحب اُن وقت ڪپڙن جي ويڙهه ۾ پاڻ لڪائي ويٺي رياضت ڪئي. شاهه صاحب ڪيس ڏسي فرمايو ته، "يار کي لڪائڻ نه گھرجي، پر هن کي ٻاهر آڻجي." اِنهيءَ تي هُو صاحب ٻاهر نڪري آيو. وري ٻئي دفعي جڏهين درازن ۾ آيو، تڏهين پنجن ورهين جي ٻالڪ کي "سچل" کي ڏسي فرمايائين ته، "اَسان جيڪو ڪنو چاڙهيو آهي، تنهنجو ڍڪڻ هي لاهيندو."

چون ٿا ته مخدوم دين محمد صديقي سيوهاڻيءَ جي به، شاهه صاحب سان گھاٽي دوستي هوندي هئي. اِنهيءَ ڪري، شاهه صاحب جو، گھڻيئي دفعا، سيوهڻ ۾ وڃڻ ٿيو. ٻنهيءَ جي پاڻ ۾ ايڏي ته محبت هئي، جو هڪ لڳا پاڻ ۾ دستارون بدلائي، پڳ مٽيا يار ٻڌيا هئا.

شاهه صاحب جي، مدن ڀڳت سان به، گھاٽي پريت هئي. مدن صاحب، ڪوٽڙي مغل جو ويٺل هو، ۽ وڏي پهچ وارو فقير هو. شاهه صاحب، هن هندو

صوفيءَ سان به چڱيون رهاڻيون ڪيون.

شاهه صاحب جو روحاني طريقو ڪهڙو به هجي: سندس ڪلام مان ظاهر آهي ته هو مذهبي اِختلافن کان مٿي هو: هر شيءِ ۾ حق جو جلوو پسندڙ هو.

ڏسڻ ڏسين جي، ته همه ڪي حق چوين.

شاهه جو مذهب

شاهه صاحب نڪي شيعو، نڪي هو سني. هڪ لڳا سوال پڇيو ويس ته، "سائين اوهين سني آهيو يا شيعا؟" جواب ۾ فرمايائين ته، "مان ٻنهي جي وچ ۾ آهيان." چيائونس ته "قبلا! ٻنهي جي وچ ۾ ته ڪي ڪين آهي." فرمايائين ته، "آهيان ته اِهو ڪي ڪين."

پڇيو ئي جان دوست، تان پاسي ڪر پرهيز ڪي،
جئين ڏنو هوت، تن دين سپيئي دور ڪيا.

جيتوڻيڪ باطن ۾ هڪ صوفي عارف هو، ته به ظاهري طرح، ماڻهن جي صحيح هدايت لاءِ شريعت جا سڀ حق پوريءَ ريت بجا آڻيندو هو. باطن ۾ توڙي ظاهر ۾، هڪ ڪامل هادي ۽ رهبر هو. سندس هدايت آهي:

ڪر طريقت تڪيو، شريعت سجاڻ،
هنئون حقيقت هير تون، ماڳ معرفت ماڻ،
هوءِ ثابوتي ساڻ، ته پسڻ کان پالهو رهين.

اشوک کمار

بيت

واريءَ تي لکيل نانءُ هُن جو
هوائون لڳڻ سان وِکري ويو
ٿِميا ڳوڙها اُجايل واريءَ تي
واريءَ جو رُوپ نکري ويو

اشوک کمار

وائي

ٿر جي ٿڌي واريءَ ۾
نيڻ جهڪيل ناريءَ ۾
سنڌ وسي ٿي
ڪندن جي ٿاريءَ ۾
دل جي دنيا ساريءَ ۾
سنڌ وسي ٿي

اشوک کمار

گیت

تنهنجو منهنجو رت ٻہ ساڳيو، پچندڙ گهر ۾ پيٽ ٻہ ساڳيو
پوءِ ڇو مان هندو ۽ تون مسلمان، ڇو ماريو اٿئي اندر جو انسان

تنهنجي منهنجي ريت ٻہ ساڳي، ٻنهي ڀائرن جي پريت ٻہ ساڳي
ايئن نہ رسائي پنهنجن کي نقصان، ڇو ماريو اٿئي اندر جو انسان

تنهنجي منهنجي واٽ ٻہ ساڳي، ٻرندڙ ڏيئي جي لاٽ ٻہ ساڳي
ايئن نہ وڃائي تون پنهنجي سڃاڻ، ڇو ماريو اٿئي اندر جو انسان

تنهنجو منهنجو ديس ٻہ ساڳيو، انگ اگهاڙي تي ويس ٻہ ساڳيو
ڳولي تہ ڏس زاهد ۾ ڀڳوان، ڇو ماريو اٿئي اندر جو انسان

موتين جهڙا لڙڪ ٻہ ساڳيا، ڇپن تي ايندڙ مرڪ ٻہ ساڳيا
ڳولي تہ ڏس اشوڪ ۾ رحمان، ڇو ماريو اٿئي اندر جو انسان.

رباب میمن

نیٹن

کیترا فاصلا آھن، درد دادلا آھن
لڙکن جا نینڙ مان، نکتا قافلا آھن

محمد صدیق

آزاد نظم

حياتي جي ناٽڪ جا ليکڪ
حياتي جي ناٽڪ جا ليکڪ
هي ڪهڙو ناٽڪ لکي ويٺو آهين
اڳ ۾ ڪردار جهلائي ڇڏيو سچي جو
اڻ ڄاڻائي ۾ ڪردار نڀايو ٻچي جو
رنگ انهي ۾ ڀيا گهربل هئا
ماءُ ۽ پيءُ جي روپ ۾ ٻه
وڏا رنگين سڀ ڪردار هئا
اها سموري تحرير ڇا تنهنجي هئي
ياءُ راجا ۽ پيڻ پياري هئي
جڏهن اسين هن رنگ ۾ ڍلجي ويا سين
تو تحرير ئي بدلائي ڇڏي ۽
اسين ڪردار بدلجي ويا سين
منهنجي پي کي ٻيهر ٻار ڪري ڇڏيو
۽ مون ٻار کي ڇو پي بڻائي ڇڏيو
ڄاڻ آهي اسين بنا لکيل تحرير پڙهندا هئا سين
حياتي جي هر ڪردار کان وڙهندا هئا سين
ڇا اسان کي هن اداڪاري کان آرام ملندو
هاڻي ٻڌائي ٻه ڇڏ اهو ناٽڪ ڪيترو هلندو

عربی

◆ کہانی ۱۷۳

محمد عمیر سلہری

أَضْرارُ الخَوفُ (خوف کے نقصانات)

يحكى أن فأرا قال للأسد بثقة عالية:

إسمح لى أيها الأسد أن أتكلم وأعطنى الأمان...

فقال له الأسد: تكلم أيها الفأر الشجاع.

قال الفأر: أنا أستطيع ان أقتلك فى غضون شهر.

ضحك الأسد فى استهزاء وقال له: أأنت أيها الفأر؟

قال الفأر: نعم ...فقط..أمهلنى شهرا واحدا...

قال الأسد: موافق، ولكن بعد شهر سوف أقتلك إن لم تقتلنى: مرت الأيام...

الأسبوع الأول: ضحك الأسد لكنه كان يرى فى بعض أحلامه أن الفأر فعلا يقتله، لكنه لم يأخذ الموضوع بجدية...

الأسبوع الثانى: بدأ الخوف يتغلغل إلى صدر الأسد.

الأسبوع الثالث: كان الخوف تمكن من الأسد وبدأ يحدث نفسه، ماذا لو كان كلام الفأر صحيحا...

الأسبوع الرابع: كان الأسد مرعوباً مذعورا...

وفى اليوم المرتقب دخلت الحيوانات مع الفأر على الأسد.

وكم كانت المفاجأة كبيرة لما رأوا الأسد جثة هامدة...

لقد علم الفأر أن انتظار المصائب والتفكير فيها هو أشد قساوة على النفس...

الخلاصة:

هل تعلم من هو الأسد؟

هو الشخصية المهترئة التي من المفترض أن تكون قوية بإيمانها

والفأر: هو القلق والخوف من الأشياء مثل الفقر والمرض.

لذلك عش حياة إيجابية ولا تشغل نفسك بما هو آت وركز في يومك الحالي واترك فيه انجازا.

Annual Students' Magazine

NUMŪD

Volume 11, 2022

Editor: Zahid Hassan

Sub-Editors: Maryam Amir
Natalia Hayat

LUMS | Gurmani Centre for Languages and Literature